خدوخال



صادق نوید

زیرِ اہتمام : "ادارۂ عصری ادب" حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۱

جملہ حقوق بہ حقِ مصنّف محفوظ

تاریخ و سنِ اشاعت	مئی ۱۹۹۴ء
بارِ اوّل	پانچ سو
کتابت	شفیع اقبال
ڈیزائن سرِ ورق	فہیم احمد
طباعت سرِ ورق	یونک پرنٹرس۔ نکڑ کوٹ۔
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس۔ چھتہ بازار۔ حیدرآباد ۲
تزئین و ترتیب	شفیع اقبال
زیرِ اہتمام	ادارۂ عصری ادب، حیدرآباد

791.4391
SAD

قیمت : ۶۰ روپے

جزوی اعانت اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، حیدرآباد

کتابیں ملنے کے پتے:-

Acc. No.
670

* حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، چارمینار۔ حیدرآباد ۲۔
* اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار۔ حیدرآباد۔ ۲
* مصنّف: مکان نمبر 47 - 3 - 11، دوسری منزل، جدید ملے پلی۔ حیدرآباد ۱

اِنتساب

○ شفیق والدِ محترم محمد وزیر آوازؔ مرحوم کے نام
جن سے مجھے ذوقِ شعر و ادب ورثے میں ملا اور میری شاعری کے
خدوخال نمایاں ہوئے۔

○ والدہ محترمہ عابدہ بیگم کے نام
جنکی بے پایاں شفقت اور دُعائیں میری حیات اور شاعری کی
توانائی بھی ہے اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بھی۔

جناب محبوب حسین جگر صاحب
جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست"

جناب صادق نوید کا کلام

حیدرآباد کے کسی شاعر کے کلام پر اظہارِ خیال ایک بڑا مشکل اور نازک مسئلہ ہے۔ شاعر کے خیال، فن اور اُسکے مقام پر آسانی سے اظہارِ خیال جا سکتا ہے لیکن جو شاعر ربع صدی سے شعر کہہ رہا ہے، جس کے فن کی پختگی اُسے اُستادانہ مقام عطا کرتی ہے، جس کے خیالات و نظریۂ حیات، نئے عالمی آفاقی شعور کا ایک جز ہیں، جس کا ہر شعر آج کے حالات کا وہ آئینہ ہے جس میں آپ آج کی دنیا کو دیکھ سکتے ہیں، اس شاعر کے مقام کے تعین کے لئے صرف پیش لفظ یا مقدمہ لکھنے والے کے لئے مشکل کام نہیں بلکہ جو یہ مجموعۂ کلام پڑھے گا وہ بھی سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ہم اپنی صف میں کتنے صاحبانِ فن و ہنر رکھتے ہیں مگر ہمارا ادبی دور اِن سے انصاف نہیں کرتا۔ مسٹر صادق نوید نے بلند علمی قامت پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اُردو خدمات پر اپنا ایم۔ اے، کا مقالہ لکھا۔ شروانی صاحب مرحوم نے حیدرآباد کی تاریخ کو بہت کچھ دیا۔ حیدرآباد کے مورخین کا جب کوئی تذکرہ لکھا جائے گا شروانی صاحب کا مقام صفِ اوّل میں ہوگا۔ صادق نوید نے شروانی صاحب پر تحقیق میں جو وقت گزارا وہ اُنکی فکر اور شخصیت میں تعمیر ساز رہا۔ اتنی بڑی اہم علمی شخصیت پر تحقیق میں صادق نوید کی فکر کی تعمیر میں بڑی مدد ملی۔ انکی شاعری میں جو روحِ عصر ہے وہ اس نئی شعری تاریخ کا حصہ ہے جسے شروانی صاحب اگر آج باحیات ہوتے تو قلمبند کرتے۔

صادق نوید کی شاعری کی دو خصوصیات ہیں ایک تو اُن کی فکر پہ تاریخ و تحقیق کی چھاپ ہے جو اُن کے اشعار کو آج کے حالات کی تصویر و تعبیر بناتی ہے۔ دوسری خصوصیت وہ زبان ہے

جو آزادی کے بعد اُردو شعر وادب کا ایک نیا آسان رویہ ہے۔ صادق نوید کو پڑھئے دل کا درد اور غم جاناں جو ہماری شاعری کا ایک اہم حصہ ہے مشکل ملے گا۔ انکی شاعری میں آج کے نئے حالات کی تبدیلیاں ہیں اور بہتر مستقبل کی تلاش بھی ہے۔ اتنے اہتمام سے شعر کہنے والے صادق نوید کو تو کافی حد اہمیت حاصل ہونی چاہیئے تھی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر میں نے اپنے پیش لفظ کی ابتداء میں کہا ہے کہ حیدر آباد کے اچھے شاعروں کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل ہے چونکہ انہیں ان کے فن اور تخیل کے باوجود وہ عظمت و اعتراف حاصل نہیں ہوا جو آج ہمارے مشاعرے کے شاعروں کو حاصل ہے۔

صادق نوید کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے میں خود ایک احساس جرم میں مبتلاء ہوں کہ "سیاست" نے ۴۴ سال میں صادق نوید کی شاعری کے تعارف میں آیا اپنا فرض انجام دیا ہے۔ آیا صادق نوید کو متعارف کروایا ہے۔ رسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ نے ان سے انصاف کیا؟

حیدر آباد کی یہ بدنصیبی رہی ہے کہ ہمارے عظیم فنکار وہ شہرت اور مقام حاصل نہ کرسکے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ زور صاحب مرحوم نے ان روایات کو توڑا تھا عابد علیخاں صاحب نے اس مقصد کے لئے مشاعروں اور ادبی ٹرسٹ کی بنیاد ڈالی مگر کام باقی ہے اور صادق نوید ہی نہیں کئی اچھے شعراء ہماری صحافت، ذرائع ابلاغ اور نقادوں اور مبصرین سے انصاف یا نظر کرم نہیں تو کم از کم لازمی توجہ کے مستحق ہیں۔

میں اپنے ادّعا کے ثبوت کے لئے چند شعر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے۔ اختلاف ناممکن ہے۔

مانا کہ زمانے کی ہے آب و ہوا میلی
ہم ہونے نہیں دیں گے آپس کی فضا میلی

کہنے کو ایک جیسے ہیں دنیا کے آدمی
لیکن سب اپنی اپنی زبانوں میں بٹ گئے

خود اپنے دور کی تاریخ بن گئے ہم لوگ
مٹا کے ہم کو ترا فخر آسماں ٹوٹا

وقت کے تیور سے اندازہ کرو
کتنا برہم ہے نظامِ زندگی

تخیل کو نیا آہنگ دے دیں
تقاضائے شعورِ ارتقاء ہے

بے حسی کی وہ کڑی دھوپ کے جلتے ہیں شجر
جسم مجبور کہ آپ اپنا ہی سایہ مانگے

محبوب حسین جگر
جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست"
۱۴ ستمبر ۱۹۹۳ء

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

"خدوخال" کا جائزہ

شاعری انسانوں میں شعورِ ذات پیدا کرتی ہے اور شعورِ ذات ہی انکشاف کی راہیں کھولتا ہے اس انکشاف کے لئے غزل سے بہتر اور کوئی صنف اُردو شاعری میں نہیں۔

آج کے دور کی جو غزل ہمارے سامنے آئی ہے اُس کے خدوخال سابقہ ادوار کی کلاسیکی غزل سے مختلف ہے۔ یہ ایک نئے طرزِ احساس کی نمائندہ ہے لیکن اس میں دو دھارے صاف نظر آتے ہیں۔ ایک انتہا پسندی کا ہے جو جدیدیت زدگی کا شکار ہے۔ ان کے اندر جھانکنے پر بھی غزل جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ دوسرا طبقہ ان شاعروں کا ہے جنھوں نے غزل کو اسکی کلاسکی روایت کے ساتھ اپنایا ہے اسکی توسیع کی ہے اور مروجہ اقدار سے انحراف نہیں کیا ہے۔ قدیم کو جدید سے علحدہ کرنے کے بجائے جدید کو قدیم کے ساتھ منسلک کیا ہے بیتعدد شعراء اس رویہ کو مستحکم کرنے میں سرگرمِ تخلیق ہیں اور اپنی اپنی تاب و توانائی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ صادق نوید کا یہ شعری مجموعہ "خدوخال" اسی طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

صادق نوید کو میں نے نزدیک و دُور سے دیکھا ہے اور سُنا بھی ہے۔ مزید برآں ان کا یہ تعارف کہ ان کے والد محمد وزیر آواز استاد جلیل کے حلقۂ تلامذہ میں تھے مجھے اور بھی ان کے قریب لاتا ہے گویا نوید نے شاعری ورثہ میں پائی ہے مجھے خوشی ہے کہ اُنھوں نے وراثت کی اس روایت کو قائم رکھا ہے

اور اپنی شاعری کے لیے صنفِ غزل کا انتخاب کیا ہے۔ وہی غزل جو اپنے عہد کا سارا زہر پی کر بھی زندہ ہے جس پر کئی بار خزاں آئی اور کئی بار اس کے پتّے خشک ہو کر جھڑے ہیں اور پھر تازہ کونپلیں پھوٹی ہیں۔

فراقؔ گورکھپوری نے جہاں غزل کو آسمان کی بلندیوں تک پہچایا وہیں اپنے تنقیدی انداز میں یوں بھی کہا۔

"غزل کی شاعری ایک مہذب رچی ہوئی بیکاری ہے لیکن شائد ایسی بے کاری جو فلسفہ و تمدن کی روحِ رواں بن سکتی ہے۔"

صادق نویدؔ نے اس بیکاری کی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے فراقؔ کے بیان کو یوں دُہرایا ہے۔

کوئی ناداں ہو تو کہتا ہے یہی
شاعری ہے مشغلہ بیکار سا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صادق نویدؔ نے ابتدا میں اپنے جمالیاتی تجربوں کی نقش گری کے پیشِ نظر غزل کا انتخاب کیا اور حدیثِ دلبری کے لئے روایات سے گرمی اور روشنی حاصل کی۔ پھر جب بدلتے ہوئے وقت اور زندگی کی رفتار کے ساتھ شعر و ادب کے رنگ و روپ میں تبدیلیاں ناگزیر ہوئیں تو انہوں نے اپنی فکر کو سماج اور گرد و پیش سے بھی ہم آہنگ کیا لیکن اپنا رشتہ رومانویت سے منقطع نہیں کیا۔ چنانچہ تغزل کا عنصر ان کی غزلوں میں اچھا خاصا ہے۔ موضوعِ عشق کے روایتی تصوّر میں تبدیلی تو نہیں کی ہے لیکن اظہار کی تازہ کاری نے انہیں اُسے بے کیف نہیں ہونے دیا ہے ساتھ ہی ساتھ اپنی غزل کے دریچے اور دروازے دورِ حاضر کے کرب، محرومیوں، تلخیوں اور ٹوٹتی قدروں کے لئے بھی کھُلے رکھے ہیں۔

شاعری خیالات سے نہیں الفاظ سے لکھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر شمیم حنفی کے الفاظ میں "شاعری میں زبان کے تہذیبی اور تخلیقی زاویئے کی بڑی اہمیت ہے۔ بالخصوص

غزل کے لیئے جو اپنا خاص مزاج رکھتی ہے۔" آج کے شاعر کے پاس ایک تودہ الفاظ ہیں جو اُس کو غزل کی وراثت میں ملے ہیں مثلاً فصلِ گل، بہار و خزاں، جور و جفا، مہر و وفا، رہبر و رہزن، عقل و خرد، جنون و وحشت، زلف و رخسار، بادہ و ساغر، قاتل و بسمل، ساحل و منزل، برق و آشیاں، دلبری و دلداری اور اُمید و آرزو وغیرہ۔
لیکن اب غزل کا کینوس اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ نئے الفاظ و تراکیب کی شمولیت ضروری ہوگئی ہے۔ چنانچہ صادق نوید نے اس ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ایسے الفاظ کے پیکر بھی تراشے ہیں جو آج کی نئی غزل میں رواج پارہے ہیں یہ کچھ اس نوع کے ہیں جو اُن کی غزل کی لفظیات میں شامل ہیں۔

شب گزیدہ فضا، زہریلا تبسم، درد کا صحرا، اندھی مسافتیں، احساس کا سمندر، خوابیدہ تمنا، حصارِ جسم، وقت کے پتھر، کاسۂ خیال، بارشِ سنگ احساسِ کرب، زخمِ تمنا، رقصِ تبسم اور فکر کا بوجھ وغیرہ۔

استعاراتی فکر کی یہ لفظیات علائم کی صورت اختیار کرتی ہے اس لفظی نظام نے نوید کی غزلوں کو سہارا دیا ہے جس کی اوٹ سے مسائلِ حیات کی رونمائی ہوتی ہے۔ زندگی ہر لمحے ایک نیا منظر نامہ مرتب کرتی ہے۔ شاعر اپنے تجربات اپنے زمانے کے ماحول سے حاصل کرتا ہے اور لاشعور کے خزانے سے بھی استفادہ کرتا ہے۔ صادق نوید نے اپنی تخلیقی قوت سے اپنی غزل کے تانے بانے بُنے ہیں اور اس میں اپنا پن بھی شامل کیا ہے۔ انہوں نے اپنے ذہنی سفر میں ہمواریت اور اس کے پیچ و خم کو جن زاویوں سے دیکھا ہے اسے اپنی فکر میں داخل کرنے کی سعی کی ہے۔

کلام کا مطالعہ یہ بھی انکشاف کرتا ہے کہ صادق نوید کسی ادبی میلان سے وابستہ نہیں ہیں لیکن وہ چونکہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اسلئے وہ عوامل اُن کی غزلوں میں خود بخود در آئے جو زندگی کے حقیقی تجربات سے نمو پاتے ہیں۔ جدیدیوں اور روایت پرستوں کے درمیان اُنھوں نے جو راہ اختیار کی ہے اسے تقلیدی ہوتے ہوئے بھی اپنے مزاج سے ہم آہنگ

کیا ہے جو قابلِ قبول بھی ہے اور قابلِ فہم بھی ۔ شاعر نے جذباتی بہاؤ میں گم ہو جانے کے بجائے صداقتِ خیال کی تلاش کو اہمیت دی ہے ۔ آج کی غزل کو نئے فکری عوامل سے مربوط کرنے میں اقدار کے زوال پر نوحہ کرنے کے بجائے طنز سے کام لیا ہے جو اس دور کا مقبول رویہ ہے لیکن یہ بات جناب نوید کے ہاں للکار کی صورت میں نہیں بلکہ انہوں نے اپنی بات زیرِ لبی کیفیت میں پیش کی ہے ۔

اس دور میں شاعری اور فن کا جو ربط ٹوٹ گیا ہے وہ ایک بڑا المیہ ہے ۔ موجودہ نسل میں جو سہل پسندی ہے یہ رجحان عام ہو رہا ہے لیکن یہ اس ہجوم میں شامل نہیں ۔ صادق نوید کا بنیادی رشتہ اور سلسلہ چونکہ کلاسیکی شاعری سے جڑا ہوا ہے اس لئے ان کے پاس فن کا پاس بھی ہے اور الفاظ کو صحت کے ساتھ برتنے کی احتیاط بھی ۔

" خدوخال " میں غزلوں کے علاوہ رباعی ، قطعات اور نظمیں بھی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ صادق نوید غزل کے امکانات سے زیادہ واقف ہیں ۔ آج جبکہ بے جہتی اور بے سمتی کا احساس فروغ پا رہا ہے اس تناظر میں یہ شعری مجموعہ لائقِ ستائش ہے ۔ مجھے توقع ہے کہ اس کلام کو قبولِ عام ملے گا ۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

"جلیل منزل" سلطان پورہ ۔
حیدرآباد ۔
۲۳ ؍ جون ۱۹۹۳ء

پروفیسر محترمہ سیّدہ جعفر صاحبہ
صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی و سابق صدر
شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔

"خدوخال" کے بارے میں

"خدوخال" صادق نوید کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور قطعات کا ایسا مجموعہ ہے جو اُنکے ادبی خلوص، نئی روایات کی پاسداری کے احساس اور اُنکے شائستہ طرزِ فکر کا ترجمان ہے۔ صادق نوید نے اپنی شاعری میں انسانی واردات، حیات کے سرد و گرم تجربات اور روزمرّہ زندگی کے اُن حقائق کی آئینہ داری کی ہے جن کی آنچ میں انسان پگھلتا اور نئے سانچے میں ڈھلتا رہتا ہے۔ صادق نوید کی غزلوں کو انسان کی تنہائی کے کرب اس کی بے چہرگی، ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے روابط کی کسک اور انسانی وجود کے اندر بے کراں سنّاٹے کے احساس نے عصری حسیّت عطا کی ہے۔ شعری روایات کی توانائی اور لب و لہجہ کی علامتی سطح کا توازن اُن کے کلام کی پہچان بن گیا ہے۔

۶ر نومبر ۱۹۹۳ء

پروفیسر سیّدہ جعفر صاحبہ
صدر شعبۂ اُردو، حیدرآباد یونیورسٹی
و سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ڈاکٹر طیب انصاری
صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج۔ گلبرگہ

"...... ہماری شاعری کا نام ہے"

دنیا کے سخنوروں کے بیچ غالب نے اپنے لہجے کی انفرادیت کو اپنی پہچان بتایا تھا۔ شعراء اور خصوصاً غزل گو شعراء کے بیچ، سچ تو یہ ہے کہ لہجہ ہی ہے جو ایک شاعر سے دوسرے شاعر کو ممیّز بھی کرتا ہے اور ممتاز بھی جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے غزل میں فکرِ جمیل کی پرچھائیوں کے باوجود بڑی یکسانیت اور یک رنگی پائی جاتی ہے جہاں تک لفظ و معنی کا معاملہ ہے ان میں بھی کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے عربی تنقید مطالعہ در جائزہ (ص ۱۴۳) میں بتایا ہے کہ "ابنِ طباطبا شاعری کا معیار تلاش کرتے ہوئے اس منزل پہ پہنچا ہے کہ قدیم شاعری میں الفاظ و معنی کا اس قدر بھرپور استعمال ہوا ہے کہ نئے شعراء کے لئے اس اعلیٰ معیار کی شاعری پیش کرنا بہت دشوار کام ہے اس لئے ہر ایک نادر و جدید معنی، فصیح لفظ لطیف خیال اور سحر آفرینی کی جا چکی ہے۔ جدید شعراء کے لئے اب کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

اُردو شاعری میں وَلی، میر، غالب، اقبال اور جوش نے الفاظ کا انتہائی سادہ بھی اور انتہائی پُرجوش استعمال کیا ہے۔ اب لفظ اکثر شعراء کی پہچان بن گئے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود آج جو نئے شعراء ہمارے سامنے ہیں جن میں یقیناً صادق نوید بھی شامل ہیں، انہوں نے اپنے برتاؤ سے لفظ کو نیا پیرہن اور نیا مفہوم ضرور عطا کیا ہے اس لئے بھی کہ زمانے کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی اپنا مفہوم بدل دیتے ہیں۔ سے

اصطلاحاً ہم بھی پی لیتے ہیں، گو پیتے نہیں
چشمِ ساقی کا کرم ہے میکدے کی شام ہے

علامہ اقبال نے نہ صرف جام، ساقی اور مے کے مفہوم کو بدلا بلکہ عشق کے تصوّر کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ اصل میں شاعر اپنی مخصوص فضا اور اپنے عصر میں رہ کر بھی الفاظ کو استعمال کرتا ہے اور بعض اوقات وہ الفاظ کو نئی معنویت عطا کرتا ہے یہ اس کے برتاؤ پہ منحصر ہے۔ صادق نوید نے شاعری میں الفاظ کے مزاج اور اُن کے مفاہیم کو اپنے طور پر سمجھا اور برتا ہے۔ یہ وہی الفاظ ہیں جنھیں میر و غالبؔ، حالیؔ اور اقبالؔ نے برتے ہیں لیکن ان الفاظ کی فضا نئی ہے۔ اور عصری [illegible] نے ان الفاظ کو نئے معنیٰ عطا کئے ہیں۔ وہ غزل ایسی روایتی صنفِ سخن کے شاعر ہیں لیکن اپنی جودتِ طبع اور رنگینیٔ خیال سے اسی پرانی غزل کو نیا پیرہن دیا ہے نئے معنیٰ دیئے ہیں اور یہ سب کچھ اُنہوں نے "آرزوئے داد اور فکرِ صلہ" کے بغیر کیا ہے۔ ؎

آئینۂ حیات ہے اپنی غزل نویدؔ
ہے آرزوئے داد نہ فکرِ صلہ مجھے

ایک زمانہ غزل کا منکر ہے اس کے باوجود ظالم چیز ہی ایسی ہے جو منہ سے ایک بار لگنے کے بعد چھوٹتی نہیں ہے۔ خصوصاً اُردو دشمنی کے اس دور میں بقول کسے "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے"۔ غزل آج کی محبوب ترین صنفِ شاعری ہے۔ رومین رولاں نے کہا تھا۔

"بڑے فنکار وہ بھی ہوتے ہیں جو اپنی ترجمانی کرتے ہیں لیکن بڑے فنکار وہ ہیں جن کے دل سب انسانوں کے لئے دھڑکتے ہیں رومین رولاں نے بات فنکار کی کی ہے لیکن یہی بات فن اور خصوصیت سے غزل ایسے فن کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر فرد کا ہی نہیں افراد کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے غزل کے ایک ایک شعر پہ قاری ہو کہ سامع تڑپ اُٹھتا ہے

رات کس منچلے پروانے کا ارماں نکلا
شمع کیوں ہو گئی خاموش بجھے دل کی طرح

دل کے ہاتھوں زندگی میں ہم لٹے تھے ایک بار
اپنی بربادی کے قصّے بارہا چلتے رہے!

پھیلے جو ہم تو ہو گئے وسعت میں کائنات
سمٹے تو درد بن کے دلوں میں سما گئے

کیونکر کہوں کہ اس نے نہ دیکھا مری طرف
وہ دیکھتا تو ہے مگر اغیار کی طرح

صادق نویدؔ کا انداز یہاں تیکھا بھی ہے اور نیا بھی ؂

پھر خود کو سمیٹا نہ جا سکے
شیشے کی طرح ٹوٹ کے ایسے بکھر نہ جا

ہوش و خرد کی دھوپ میں تپتے ہوئے بدن
وہم و گماں کی چھاؤں میں آرام پا گئے

مانگ کر چہرہ کسی کا مدتوں بے چہرہ لوگ
شاعری کے دشت میں بے دست و پا چلتے رہے

اگر شاعر کی گرفت الفاظ پر مضبوط ہے تو وہ جوشؔ کی طرح ہر لفظ کو اپنے طور

پر استعمال کرلیتا ہے۔ لفظ اس کے لئے بیندھے دام کی طرح ہوتا ہے لیکن یہ گرفت بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ بیچارے ڈھونڈ ڈھونڈ کر الفاظ لاتے ہیں اور انہیں استعمال کرتے ہیں یہیں آمد اور آورد کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

صادق نوید کی شاعری میں جو آمد ہے ان کی الفاظ پر اسی گرفت کا نتیجہ ہے ؎

قلم سے بیعت لے اقلیم دل کو
یہی سب سے بڑی قد آوری ہے

صادق نوید نے ایک جگہ کہا ہے ؎

ڈھلتے ہیں لفظ شعر کے پیکر میں اب نوید
موسم کی طرح تیز ہے فکر و نظر کی دھوپ

صادق نوید کی زبان بنیادی طور پر غزل کی زبان ہے۔ تیکھی اور شوخ الفاظ کا دروبست، محاورہ اور تشبیہ، استعارہ اور تلمیح سب ہی کچھ ان کے یہاں مل جائے گا۔ انہوں نے لفظیات کی نئی نعت بھی استعمال کی ہے۔ معرّی اور آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کسی بھی شاعری کو جدید و قدیم کے خانوں میں بانٹ نہیں سکتے۔

صادق نوید کے یہاں غزل ڈکشن کے لحاظ سے قدیم اور فکر و نظر کے اعتبار سے جدید ہے۔ علامہ اقبال نے سچ ہی کہا تھا کہ قصہ قدیم و جدید بے معنی اور لغو ہے۔ کوئی شاعر غزل کہے اور روایت سے انحراف کرے ممکن نہیں ہے۔ فن کے اعتبار سے جب تک وہ غزل کی لازمی اور ضروری فنی قیود کا احترام نہیں کرتا وہ غزل گو شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔

ہاں! وہ لفظیات، اظہار و معنی کے لحاظ سے فکرِ جدید اور عصری مسائل کو اپنی غزل میں جگہ دے سکتا ہے اور ایسا ہی ہر دور میں ہوا ہے۔ زمانۂ گزشتہ میں بھی کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو توفیق حیدر آبادی صفی اورنگ آبادی کے دور میں رہا ہو اور اس نے وجہی اور غواصی کے

عہد کی زبان کو برتنا اور اُس دور کے مسائل پر خامہ فرسائی کیا ہو۔ یہ دعویٰ بجائے خود بیکا دا ہے کہ کوئی شاعر کلی طور پر جدید یا عصری حسیت کا علمبردار ہے۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ صادق نوید قدماء کے فن اور معاصرین کی فکر کی اپنی شاعری کے ذریعے نمائندگی کرتے ہیں صادق نوید عہدِ حاضر کے شاعر ہیں اور اُن کی نظر عہدِ جدید کے گھناؤنے مسائل پر بڑی گہری ہے جیساکہ وہ کہتے ہیں ؎

جب کہوں دل کی واردات کہوں
یا پھر عینی مشاہدات کہوں
عقل گھڑتی رہے گی تاویلیں
غیر ممکن ہے دن کو رات کہوں

ان کی آنکھ بہت تیز ہے اس لئے اُن کے مشاہدے میں عصرِ حاضر کی درندگی، لوٹ کھسوٹ، تعصب وحسد، خودغرضی، خونریزی اور انسانی زندگی کی تباہی کے مناظر سب ہی کچھ ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں ان کا تاثر قبول کرتے ہیں اور غزل کی تنگنائی کے باوجود اپنی شاعری میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں ؎

نہیں جو مانعِ ابلاغ تنگنائے غزل
نویدؔ شوق کی ترسیل اقتشامے ہے

کیا حال رقم کرتے ہم شہرِ تمنّا کا
اُلفت کی جگہ نفرت، تہذیب دغا بیلی

اتنے سُبک ہوئے کہ زمیں پر نہ ٹک سکے
بے خانماں پرند اُڑانوں میں بٹ گئے

احساسِ کرب، سوزِ دروں، تشنگی، گھٹن
ذکرِ غمِ حیات ہے یہ داستاں نہیں

ہوئے رخصت صفاتِ آدمیّت
بظاہر دیکھنے میں آدمی ہے

یہ شہر شہر فسادوں کا سلسلہ کیسا
مزاجِ وقت مسلسل خراب ہے اب کے

عہدِ حاضر کا المیہ ملاحظہ ہو ؎

لہو سے اپنے چمن لالہ زار اپنا ہے
گلوں کا ہو جو محافظ وہ خار اپنا ہے

سایہ دار اک شجر نہیں ملتا
گھر سے نکلیں تو گھر نہیں ملتا

صادق نوید کی شاعری اگر صحرا ہے تو اس میں نخلستان بھی آپ کو ملیں گے اور اگر سمندر ہے تو اُمید و وفا کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی یہاں دم لینے کو ہیں ؎

ہم کسی اِک دائرے میں قید کیا ہوتے نوید
ہر جگہ آزاد، مانندِ ہوا چلتے رہے

اُمید، یقین، حیاتِ انسانی کا قابلِ قدر اثاثہ ہے۔ شاعر تو شاعر کسی بھی فنکار کو

اُمید و یقین سے ہاتھ اُٹھا لینے یا ان سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔
دھوپ چھاؤں انسان کا مقدر ہیں ان سے بچ کر کہاں جائیے گا ؟!
پچھلے چند برسوں سے شعری مجموعے بہت اچھے چھپ رہے ہیں ورنہ اک
زمانہ تھا صفیؔ جیسے بلند قامت شاعر نے کربناک لہجے میں کہا تھا ؎

"میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں"

مجھے معلوم نہیں کہ اُردو اکیڈمی کی اِعانت انہیں حاصل ہے یا نہیں، اگر ہے تو یہ اس کے
یقیناً مستحق ہیں۔

صادق نویدؔ نے یہ کہہ کر تعلّی نہیں کی ہے، اظہارِ حقیقت کیا ہے ؎

محفلِ شعر و سخن کا بانکپن ہم ہیں نویدؔ
ہم سے وابستہ ہماری شاعری کا نام ہے

نہ صرف یہ کہ ان کی شاعری سے ان کا نام وابستہ ہے بلکہ عصری شاعری میں
بھی ان کا نام زندہ و باقی رہے گا، اور ان کے بیشتر اشعار زمانہ ازبر کرلے گا۔

ڈاکٹر طیّب انصاری
۷ر نومبر ۱۹۹۳ء
"المنیر" 1/6/5-3-10، مہدی پٹنم۔ حیدرآباد ۲۸ء

ڈاکٹر محمد انور الدین
ریڈر شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد،
۵۰۰۱۳۴،

منفرد شاعر صادق نوید

غالب غزل کی تنگ دامانی کے شاکی تھے شاید اسی لیئے اُنہوں نے کہا تھا ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیئے

لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غزل عمر و عیار کی زنبیل ہے جس میں ہر طرح کے مضامین سمیٹے جا سکتے ہیں۔ نت نئی ترقیات نے انسان کو جہاں ہر طرح آسائش کے مواقع فراہم کیئے ہیں وہیں نسلِ انسانی کو بے شمار مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اس کا اثر ادب پر پڑنا لازمی تھا۔ چنانچہ غزل نے بھی نئے دور کے اثرات قبول کیئے۔ ترقی پسند تحریک نے کسی قدر غزل کو معتوب قرار دیا تھا لیکن اس کے سحر سے آزاد ہونا ترقی پسندوں کے لیئے بھی ممکن نہ ہوسکا اور غزل اپنے پورے جمال و جلال کے ساتھ آسمانِ ادب پر جلوہ فگن رہی۔ جن اُردو شعراء نے اپنے خونِ جگر سے اس پودے کی آبیاری کی ان میں ایک نام صادق نوید کا بھی ہے۔ جو پچھلے تیس برس سے شعر کہہ رہے ہیں۔ صادق نوید خوابوں کی دنیا کے شاعر نہیں ہیں۔ صادق نوید کے یہاں فن کار چاؤ بھی ہے اور وہ اپنے عصر سے ہم آہنگ بھی ہیں وہ زندگی کو اپنی پوری کیفیات کے ساتھ برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز کے باوجود اُنہوں نے شاعری کو اپنے جذبات و احساسات کی ترسیل کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا۔ زبان واری کردہ بندیوں پر صادق نوید نے کس سلیقے سے کہا ہے ؎

کہنے کو ایک جیسے ہیں دنیا کے آدمی ٭ لیکن سب اپنی اپنی زبانوں میں بٹ گئے

صادق نوید کی شاعری کا محور انسان ہے۔ انسانیت ہے۔ وہ اس بات کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں کہ یہ بڑھتی ہوئی آبادیاں آدمی کو نگلتی جارہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

یوں تو آبادیوں کے جنگل میں
آدمی ہے مگر نہیں ملتا

دورِ حاضر نے جہاں انسان سے انسانیت چھین لی ہے وہیں آنے والی نسلوں کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج کے بچوں میں وہ بچپن نہیں رہا جس کی بناء پر کسی کی شناخت ہوسکتی تھی۔ اب بچوں میں بزرگی سی آگئی ہے وہ ان تمام باتوں کو جاننے لگے ہیں جسے جاننے کیلئے ایک زمانہ درکار ہوتا تھا۔ صادق نوید کا یہ شعر ان کے گہرے نفسیاتی مطالعے کا غماز ہے ؎

آج کے بچوں میں بچپن کا وہ بھولا پن کہاں
سب کے سب بالغ ہی لگتے ہیں کوئی بچہ نہیں

صادق نوید کو صرف غزل کا شاعر کہنا صحیح نہیں ہے ان کے اشہبِ قلم نے نظم کے میدان میں بھی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن زیرِ نظر مجموعے میں ان کی چند ہی نظمیں شامل ہیں۔ آخر میں کچھ قطعات اور رباعیات بھی ملتی ہیں جن سے شاعر کی قادر الکلامی اور افتادِ طبع کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کے متنوع مضامین، شاعرانہ نازک خیالی کے ساتھ عصری حسیت و معنویت انہیں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ میرے اس بیان کی تصدیق کے لئے صادق نوید کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

اخلاص کے ہونٹوں پہ زہریلا تبسم ہے
ہر نور کے پیکر نے پہنی ہے قبا میلی

زندہ حقیقتوں کی طرف دیکھتا ہے کون
آذہان جھوٹ سچ کے فسانوں میں بٹ گئے

جسم و جاں کی یہ فصل ایسی ہے
جس میں کوسوں بشر نہیں ملتا

حالات کے پتھراؤ میں خاموش کھڑا ہوں
میں خود بھی مرے حال میں شامل نہیں ہوتا

ڈاکٹر انورالدین
ریڈر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

جناب صلاح الدین نیّر

تہذیبی تسلسل اور عصرِ جدید کا نمائندہ شاعر

صادق نوید

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اکثر اوقات کم آمیزی روابط کے استحکام اور اس کے ارتقاء میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کم آمیزی احساس کی اعلیٰ سطح پر پہنچ کر شمعِ فروزاں کی طرح محفلِ یاراں کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے۔ جب کبھی شریفانہ روابط کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے تو بے غرض دوستی فرحت افزاء روابط کا خیر مقدم کرتی ہے۔

اچھے اور بے داغ انسان پاک وصاف اور آئینہ صفت لوگ، روابط کی ابتدائی منزل پر ہی اپنے اوصاف حمیدہ اور اپنے قول وفعل کے دیانتدارانہ طور وطریق سے معاشرے کی شگفتہ اور خوشگوار فضاء کو عطر آمیز بنا دیتے ہیں۔ جب بھی روابط ارتقائی منازل طئے کرتے ہیں تو دوستی کی ساری قدریں اپنا پُرکیف اثر چھوڑ جاتی ہیں پھر مشاہدات اور تجربات کی ہم آہنگی، رسم وراہ اور اندازِ گفتگو کی وابستگی، کردار اور شخصیت کی نفاست پسندی دوستی کی بنیادیں مستحکم کر دیتی ہے۔

صادق نوید کے بے ریا روابط نے دوستی کی بنیاد کو استحکام بخشا ہے۔ میں صادق نوید کو اپنے بعض قریب ترین دوستوں کی طرح باوقار، پُربہار، معتبر اور اُصول پسند انسان سمجھتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ صادق نوید معاملہ فہم، صداقت پرست اور ایک باحوصلہ انسان ہیں۔ صادق نوید سے میری رسم وراہ اور دوستی کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ وہ یقیناً تیس برس سے زیادہ عرصے سے شعروادب کی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ میں نے مختلف مقامات پر کئی مشاعرے ان کے ساتھ پڑھے ہیں۔ ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ حیثیت سے اُس وقت سے واقف ہوں جب وہ ایک ریگولر

طالبِ علم کی حیثیت سے جامعۂ عثمانیہ سے اُردو ایم۔اے (Regular) کر رہے تھے۔ اُنہوں نے پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اُردو خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو ۱۹۷۵ء میں کتاب کی شکل میں شائع ہوا۔ نامور صحافی محترم محبوب حسین جگرؔ جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ سیاست نے اُردو ہال میں منعقدہ جلسے میں اس کتاب کی رسم اجراء انجام دی۔ اُس جلسے میں ~~صاحبِ مقالہ~~ پروفیسر ہارون خاں شروانی بھی موجود تھے۔ اس جلسے کے اہتمام کی ذمہ داری راقم الحروف کو سونپی گئی تھی۔ اُسی سال اس کتاب کو آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے پہلے پیاچ میں انعام کا مستحق قرار دیا گیا اس کتاب کی اشاعت کے بعد صادق نوید کی شناخت میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ حیدرآباد اور حیدرآباد سے باہر کے علمی ادبی حلقوں میں اس کتاب کی اچھی خاصی پذیرائی ہوئی۔

میں پانچ سال قبل حیدرآباد کے پُرانے شہر کے ایک قدیم محلّے سیّد علی چبوترہ (روپ لال بازار) میں اپنے ذاتی مکان میں تھا۔ جب میں نے ملے پلی (راشم گراؤنڈ کے روبرو) مکان خریدا اور مستقل سکونت اختیار کی تو صادق نوید سے بھی دوستانہ اور شاعرانہ روابط کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملے پلی میں سکونت پذیر شاعروں میں میرے سب سے قدیم شاعر دوست مومن خاں شوقؔ ہیں جنھیں میں زائد از پندرہ برس سے جانتا ہوں۔ "ایوانِ اُردو" میں لنچ کے اوقات میں اُن سے اکثر ملاقات ہوا کرتی تھی ان کی طرح میں بھی ادبی رسائل دیکھنے کے لئے سکریٹریٹ سے آتا تھا۔ مومن خاں شوقؔ ان دنوں "ایوانِ اُردو" سے قریب ایڈمنسٹریٹیو آفس زرعی یونیورسٹی (دلکشا) سے وابستہ تھے۔ ملے پلی میں رہنے والے میرے دوسرے شاعر دوست منان منظور ہیں جنکے مخلصانہ روابط کا سلسلہ آج بھی اُسی تازگی کے ساتھ جاری ہے۔ منان منظور سے میری ملاقات رئیس اختر کے توسط سے ہوئی تھی۔ ملے پلی میں مقیم تیسرے شاعر دوست عزیز بھارتی ہیں۔ عزیز بھارتی بہترین شاعر ہی نہیں ایک حرکیاتی انسان بھی ہیں۔ عزیز بھارتی بھی میرے دوستوں کی اولین فہرست میں شامل ہیں۔

چوتھے دوست صادق نوید ہیں۔ مجھے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں

میں صادق نوید کا کلام سننے اور اُن کو سمجھنے کا کچھ زیادہ ہی موقع ملتا رہا۔ صادق نوید ملے جلے کے اُن تین شاعر دوستوں (مومن خان شوق، منان منظور، عزیز بھارتی) جیسی خصوصیات رکھتے ہوئے بھی ایک اور حیثیت سے منفرد ہیں۔ اِن کی یہ خصوصیت مذہبی روایات سے وابستگی کے علاوہ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہونے کی بھی ہے۔

میں نے صادق نوید کو ہمیشہ ایک مخلص دوست، ادبی معاملات میں دیانتدار، بیباک اور بے لاگ انسان پایا۔ صادق نوید سے روابط کے ارتقاء میں رئیس اختر کی دلچسپی کا بھی دخل رہا ہے۔ اتفاق سے گرام جونیئر کالج میں (جہاں صادق نوید صدر شعبۂ اُردو ہیں) رئیس اختر کا ایک لڑکا غلام محمد خاں زیرِ تعلیم ہے۔ مختلف مشاعروں، ادبی جلسوں اور دیگر ادبی سرگرمیوں نے ہم کو آپس میں ایک دوسرے سے قریب کیا ہے۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۹۰ء کو صادق نوید نے ادارہ عصری ادب کے نام سے ایک ادبی اور شعری انجمن کا قیام عمل میں لایا اور اس انجمن کی سرگرمیوں کو تیز کیا تو مرکزِ ادب کے عہدیداران عزیز بھارتی، مومن خاں شوق اور قمرالدین صابری سے بھی انکی رسم و راہ بڑھنے لگی۔ اور جب ”ادارۂ میرا شہر میرے لوگ“ کی تنظیم جدید ہوئی تو ہماری ملاقاتیں رنگ لانے لگیں۔ شہر اور اضلاع کے مشاعروں میں ہم لوگوں کی ایک ساتھ شرکت نے روابط اور دوستی کے بندھنوں کو اور مضبوط کیا۔ جب ہم نے اپنی انجمنوں ”میرا شہر میرے لوگ“ ”مرکزِ ادب“ ”عصری ادب“ اور ”دیارِ ادب“ کی جانب سے ادبی جلسوں میں مختلف نوعیت کے علمی، ادبی اور تہذیبی موضوعات پر تعمیری انداز میں مذاکروں کا آغاز کیا تو ہماری سرگرمیاں اور پھیلنے لگیں۔ ”مکتبۂ شاداب“ کے بانی و صدر نشین قمرالدین صابری کی رفاقت و تعاون ہماری سرگرمیوں کے حق میں باعث تقویت بنا۔ قمرالدین صابری ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ بہترین مقرر اور صاحب فکر انسان ہیں انھوں نے اپنے آپ کو ہماری انجمنوں کی سرگرمیوں سے وابستہ کیا ہے۔

عصری مارٹن انسیٹوٹ میں ہمارے اجلاس ہوا کرتے تھے لیکن نئے انتظامیہ

نے تنظیم جدید کے نام پر دیگر ادبی انجمنوں کے جلسوں کے انعقاد کے لئے بھی اجازت نہیں دی تو ہم نے اپنی انجمنوں کے جلسوں کے لئے مکتبۂ شاداب (شاداب ہال) سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ ہمارے اجلاس نہایت پابندی سے ہوا کرتے ہیں مختلف موضوعات پر سیر حاصل مذاکروں نے شہر کی شعری و ادبی انجمنوں میں ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔ ہمارے مذاکروں کی شہرت سیاست اخبار کی معرفت نہ صرف برّصغیر بلکہ تمام اُردو دنیا، امریکہ، برطانیہ، عرب ممالک وغیرہ میں پہنچ چکی ہے۔ ہمارے متنوع اور بامقصد مذاکروں کو نہ صرف سراہا جارہا ہے بلکہ ہمارے مذاکروں کی تقلید میں بہت سی انجمنوں نے بھی مذاکروں کا آغاز کیا ہے۔ ہمارے مذاکروں کی ابتدائی خبروں اور روداد کی اشاعت کے لئے ہمیں شہر کے اُردو اخبارات سیاست، رہنمائے دکن اور منصف کا مکمل تعاون حاصل ہے۔ ہر مذاکرے کی روئیداد تقریباً تمام کی تمام مذکورہ بالا اخباروں میں دو تین کالموں میں سُرخیوں کے ساتھ شائع ہوا کرتی ہیں۔ ہم ہمیشہ ان تینوں اخبارات کے سربراہوں کے ممنون رہیں گے۔ علمی ادبی انجمنوں اور دانشورانِ شعر و ادب کی پسندیدگی کے علاوہ اخبارات کے تعاون نے ہمارے اس انقلابی اعلیٰ مقاصد پر مبنی مہم کو تیز تر کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مذاکرہ کا ہر موضوع چونکا دینے والا اور فکر انگیز ہوا کرتا ہے۔ چونکہ ہر ماہ ہماری انجمنوں کے تین یا چار اجلاس ہوا کرتے ہیں اس لئے اپنی مشاورت کے لئے ہم لوگوں کی ملاقاتیں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ "کہکشاں" مشاورت اور فیصلہ کن گفتگو کے لئے ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشاعروں کی بہتات نے بھی ہماری ملاقاتوں کو ناگزیر بنا دیا ہے۔

دوستی کی اس مختصر، مگر بار آور مدّت کے دوران میں نے صادق نوید کو کبھی کسی شاعر، ادیب یا کسی بھی انجمن کی بُرائی کرتے نہیں سُنا۔ ویسے بھی ہماری گفتگو ادبی تنظیموں، مشاعروں، ادبی جلسوں کے انعقاد اور ادب کی رفتار سے ہم رشتہ رہتی ہے۔ ادبی مسائل پر گفتگو سنجیدگی کے ساتھ پُر وقار انداز میں ہوا کرتی ہے۔ پاک دماغ اور شگفتہ دوستانہ رویّے نے ہمارے مذاکروں کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ رئیس اختر اور رحمٰن جامی علی الترتیب گلاب سنگھ باؤلی اور مراد نگر میں سکونت پذیر ہیں لیکن ہفتے

غائبانہ طور پر ہماری محفل میں موجود رہتے ہیں اور یہ دونوں ہماری گفتگو کی کسی نہ کسی منزل پر اپنی موجودگی کا شدت سے احساس دلاتے ہیں۔

صادق نوید زود گو شاعر ہونے کے علاوہ خوش گفتار مقرر بھی ہیں نپے تُلے اور سُلجھے ہوئے انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تقریر طوالت اختیار کر جاتی ہے لیکن ان کا پُر اثر لب و لہجہ طوالت کا احساس ہونے نہیں دیتا۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے تمہید پر پوری توجہ کرتے ہیں۔

صادق نوید شعر و ادب کے ہر موضوع پر اظہارِ خیال کی قدرت رکھتے ہیں۔ اُردو ادبیات میں ان کا مطالعہ گہرا ہے۔ بہترین شاعر ہونے کے علاوہ صاف ستھری اور پُر اثر نثر لکھتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جہاں متانت، سنجیدگی اور بُردباری ہے وہیں کچھ عجلت پسندی بھی ہے۔ ان کی عجلت پسندی معلومات کی کثرت کی وجہ سے بھی ہے۔ موضوعات سے متعلق جو باتیں اُن کے ذہن میں پہلے سے موجود رہتی ہیں انہیں جلد از جلد الفاظ کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ بہترین الفاظ کو منجمد کرنے یا ضائع کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ الفاظ کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔ ان کا طرزِ گفتگو تفہیمی انداز کا ہوتا ہے اس لئے ان کی بات جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ کبھی مسائل کو اُلجھا کر پیش نہیں کرتے۔ خیالات کے اظہار اور جملوں کی ادائیگی میں روانی ملتی ہے۔

صادق نوید تحت میں شعر سُناتے ہیں۔ ان کے شعر سُنانے کا انداز منفرد ہے۔ جس طرح رحمٰن جامی اور عزیز بھارتی کے شعر سُنانے کا ایک اپنا اسٹائل ہے اسی طرح صادق نوید کا بھی اپنا ایک اسٹائل (STYLE) ہے۔ مشاعروں میں یقیناً اسٹائل کی اہمیت ہے۔ اکثر شعراء اپنے کلام کے ساتھ ساتھ اپنے شعر سنانے کے اسٹائل سے بھی جانے جاتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے شہر کے بعض شعراء کا اسٹائل بھی ان کی شاعرانہ حیثیت کو بنانے میں اہم حصّہ ادا کر رہا ہے۔ صادق نوید ایک یار باش اور خوش مزاج انسان ہیں جس محفل میں صادق نوید رہتے ہیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کا وجود اس محفل

کے لئے ضروری ہے ۔ جیسے ہی وہ مسکراتے ہوئے کسی محفل میں داخل ہوتے ہیں تو شرکائے محفل کے لبوں پہ ہنسی کھل اٹھتی ہے ۔ محفل کے احاطے میں ان کی سبک روی قابلِ توجہ ہوا کرتی ہے ۔ اولین صف میں جگہ محفوظ رہنے کے باوجود تکلفات سے کام لیتے ہوئے درمیانی نشست کو پسند کرتے ہیں ۔ یہ عمل اُن کی انکساری اور بردباری کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود منتظمین محفل انہیں کسی موزوں جگہ پر بٹھا دیتے ہیں ۔ صادق نوید کی بصیرت اپنی جگہ لیکن ان کی بصارت میں ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ گفتگو سے پہلے دوستوں کے چہروں کو پڑھ لیتے ہیں ۔ قیافہ شناسی اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے چونکہ انکی بودوباش ایک ذی علم ، ادبی گھرانے میں ہوئی ہے اس لئے ان کے رکھ رکھاؤ میں متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔ ان کے والدِ محترم حضرت محمد وزیر آداؔ کا شمار حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ کے چیدہ شاگردوں میں ہوتا تھا ۔

صادق نوید کو شعر و ادب کا ماحول ورثہ میں ملا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اندازِ گفتگو ، طرزِ تکلم اور آدابِ نشست و برخاست میں وہی تہذیبی قدریں موجود ہیں جو اُن کی شخصیت کو سنوارنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں ۔

صادق نوید کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے اہم اُردو رسائل میں زمانۂ دراز سے شائع ہوتا رہا ہے ۔ حیدرآباد کے مشہور اخبار " سیاست " کے علاوہ روزنامہ " منصف " میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا ہے ۔ اخبار سیاست میں ان کا شائع شدہ کلام لندن کے اخبار " راوی " میں بھی ڈائجسٹ ہوا ہے ۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد اور دوردرشن حیدرآباد کے ذریعے باذوق اصحاب تک ان کا کلام پہنچ جاتا ہے ۔

صادق نوید کا مجموعۂ کلام " خدوخال " شعری ادب کے لئے اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ پیراہن شعر و ادب کو ہمیشہ مہکاتا رہے گا ۔ یہ مجموعۂ کلام اُردو شعری ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے ۔

صادق نوید چونکہ پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ ہیں اس لئے ان کا زیادہ وقت علمی اور ادبی مصروفیات میں گزرتا ہے اُن کے شاعر دوستوں کی فہرست طویل ہے ۔ صادق نوید کے مزاج میں جہاں سنجیدگی کا عنصر غالب ہے وہیں قدرت نے انہیں بذلہ سنجی کی نعمت سے بھی نوازا ہے ان کا حسِ مزاح لطیف ہے ۔ ان کا سُبک اندازِ تخاطب بھی مقابل کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ صادق نوید ایک اچھے دوست تو ہیں ہی اس کے ساتھ ساتھ ایک نفیس انسان بھی ہیں۔ زندگی کے ساتھ ان کا رویّہ مثبت اور دوستانہ ہے صبح و شام کی راحتوں سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ صادق نوید کا کلام منتخب محفلوں کے علاوہ بڑے بڑے عظیم مشاعروں میں بھی پسند کیا جاتا ہے ۔

میں صادق نوید کو بھی اپنے دوستوں کی فہرست میں نمایاں پاتا ہوں جو اپنی ذاتی شرافت اور بہترین شاعرانہ اور دوستانہ رویّے سے ہمیشہ متاثر کرتے رہتے ہیں ۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ان کا مجموعۂ کلام "خد و خال" ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔



صلاح الدین نیّر
"کہکشاں" 11-3-824/7
ملے پلی ۔ حیدرآباد 500001

کچھ اپنی باتیں

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ پتہ نہیں یہ بات کہاں تک صحیح ہے لیکن میری خوش قسمتی کہ میرا جنم ایک شاعر کے گھر ہوا۔ میرے والدِ محترم سید محمد وزیر آوازؔ مرحوم، فصاحت جنگ جلیلؔ کے تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے جب سے میں نے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو شاعرانہ ماحول میں پایا اور اسی شاعرانہ ماحول نے مجھے شاعر بنا دیا۔ والدِ مرحوم کے شاعر دوستوں کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں حیدر آباد کے مشہور و معروف شعراء کے علاوہ اُردو دنیا کے نامور شعراء فانیؔ بدایونی اور ماہر القادری بھی شامل ہیں۔ علامہ حیرتؔ بدایونی کے مکان کی طرح ہمارا مکان بھی ملے پلی میں تھا جہاں آئے دن والدِ مرحوم کے قریبی شاعر دوستوں کی نشستیں ہوا کرتیں بعض اوقات فنِ عروض اور رموزِ شاعری پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ میں اپنی کم سنی کے باوجود بڑی دلچسپی سے ان مباحث کو سنتا اور ذہن میں جذب کرنے کی سعی کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم عمری ہی میں میری زبان سے کلام موزوں کا آغاز ہو گیا۔ والدِ مرحوم کے خوف اور حجاب سے اپنی شاعرانہ کیفیت کو چھپائے رکھا۔ مگر تا بکے۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر باضابطہ شعر گوئی کی ابتداء ہو گئی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مخدوم محی الدین نظر بندی سے باہر آ چکے تھے۔ شاعروں میں مخدومؔ، شاہد صدیقی اور سلیمان اریبؔ کا طوطی بولتا تھا۔ مجھ جیسے کئی کم عمر مبتدی شعراء ان سے ذہنی طور پر متاثر رہے اور ترقی پسند نظریات کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپناتے رہے چنانچہ میں بھی خود اعتمادی کے ساتھ شہر کے چھوٹے بڑے مشاعروں میں حصہ لیتا رہا۔ سامعین اور اساتذۂ سخن سے داد پاتا رہا اس طرح میری حوصلہ افزائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان دنوں وحید اخترؔ اور شاذؔ تمکنت بھی اپنے اپنے لہجے کی پہچان بنا رہے تھے۔ ادھر خورشید احمد جامیؔ نے اپنے جدید لب و لہجے کی شاعری سے نئے ذہنوں کو چونکا دیا

میری شاعری کا سفر ایسے ہی ماحول سے شروع ہوتا ہے۔

میں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے پرکھا ہے اُس کا ساتھ دیا ہے، اُس کے حُسن و جمال سے محظوظ بھی ہوتا رہا اور اُسکی تلخیوں کو برداشت بھی کرتا رہا۔ ہر حال میں زندگی سے اپنا ناطہ جوڑے رکھا۔ زندگی بھی مجھے ایک نٹ کھٹ محبوبہ جیسی لگی کبھی سراپا جمال اور کبھی سراپا جلال، زندگی کے تلخ و شیریں نرم و گرم تجربات اور مشاہدات، قلبی واردات بن کر شعر کے پیکر میں ڈھلتے ہیں۔ میری شاعری انہیں رنگا رنگ عوامل کا حسین امتزاج ہے۔ شاعری میرے نزدیک حسن و عشق کی داستاں، حکایاتِ لب و رخسار، وفا اور جفا کے بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ محسوسات اور مشاہدات کے پس منظر میں جذباتِ انسانی اور فلسفۂ حیات کی مؤثر انداز میں پیشکش کا نام شاعری ہے۔ کبھی یہ داخلی نوعیت کی ہوتی ہے اور کبھی خارجی رنگ کی۔ شاعر جس دور سے گزرتا ہے اُس کا عکاس بھی ہوتا ہے۔ کوئی باشعور فنکار اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ میں نے بھی اپنے دور کے صحت مند رجحانات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ منفی اور غیر صحت مند رجحانات پر طنز بھی کیا ہے اپنے تجربات اور مشاہدات کی ترسیل میں غیر مانوس لفظیات اور علامتوں کا سہارا لے کر شاعرانہ کرتب بازی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ دلپذیر اور سیدھے سادھے دل میں اُتر جانے والے رویّے کو اپنایا ہے۔ اپنی شاعری کو تقلیدی علامتوں سے بوجھل نہیں بنایا۔ البتہ جدید تراکیب و علائم سے کام لے کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ قدماء کے فن سے استفادہ کرتے ہوئے میں نے قدامت اور بے معنی جدیدیت کے درمیان ایک قابلِ قبول روش کو اپنایا ہے۔ خطیبانہ اور ناصحانہ انداز سے گریز کرتے ہوئے معاشرے کی بے راہ روی اور بے حسی پر لطیف طنز بھی کیا ہے۔ اس طرح حتی الامکان شعری رچاؤ اور حُسنِ بیان کی لطافت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ میری شاعری کی جڑیں کلاسیکی شاعری سے پیوست ہیں اسی مضبوط بنیاد پر میں نے اپنی شاعری میں عصری حسیت کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ میں شاعری کے ایک رُخی مزاج کا قائل نہیں ہوں اور اپنے اسلاف کا منکر بھی نہیں ہوں بلکہ نئی علامتوں اور نئے

لہجے کی تازگی کے ساتھ شاعری کو اپنے دور سے ہم آہنگ کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں غزل کے کلاسیکی حسن کا پاسدار بھی ہوں اور غزل کی عصری حسیت کا طرفدار بھی۔ شاعری کو قدیم اور جدید کے دائروں میں محدود نہ کرتے ہوئے طرزِ ادا کی تازگی کے ساتھ عصری حسیت سے مملو کرنا ہی میرے خیال میں جدیدیت ہے۔ مشاہدے کی گہرائی اور تجربات کی آنچ میں تپ کر جو شعر تخلیق پاتے ہیں وہ دلوں میں اُتر جاتے ہیں اچھی اور بڑی شاعری انہیں عوامل کے زیرِ اثر عالمِ وجود میں آتی ہے۔ میرے اشعار میں فنی روایات کے ساتھ اپنے دور کے حالات اور ماحول کا عکس صاف طور پر دکھائی دے گا۔ روایت اور جدت کا یہ متوازن امتزاج میرے لہجے اور میری شاعری کی پہچان بن گیا ہے۔ میں نے اپنے ایک قطعہ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہاتھ رسماً سہی مِلانے آ
جانے والے اِسی بہانے آ
مجھ میں جدت بھی ہے روایت بھی
مجھ سے ملنے نئے زمانے آ

اپنے دور کی زنگار رنگ شاعری کی مختلف آوازوں کے ہجوم میں شامل میری آواز، اربابِ فکر ونظر کے دلوں کو چھو لے تو میں سمجھوں گا کہ میری سعی، سعیِ رائیگاں نہیں ہوئی۔

میرے مجموعۂ کلام ”خدوخال“ کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے اپنے بہی خواہوں اور عزیز دوستوں کا تعاون حاصل رہا ہے جن کا ایک عرصے سے تقاضہ تھا کہ میرا کلام کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے۔ میرے مخلص احباب جناب صلاح الدین نیر، جناب رحمٰن جامی، جناب رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر طیب انصاری، جناب مظفر احمد منظور، جناب عزیز بھارتی، جناب منان منظور، جناب مومن خان شوق اور جناب حلیم بابر (محبوب نگر) کی مسلسل توجہ دہانی کے سبب اس مجموعۂ کلام کو ترتیب دینے کی تحریک میں تیزی پیدا ہوئی جس کے لئے میں ان سب احباب کا ممنون ہوں۔

سب سے پہلے میں برِّ صغیر کے نامور شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کا شکرگزار ہوں کہ اُنہوں نے میری شاعری کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے سے نوازتے ہوئے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ خلوصِ دل کے ساتھ اُنکے تحریر کردہ ایک ایک لفظ اور دلی دعاؤں کے جواب میں سراپا سپاس گزار ہوں حیدرآباد کی ادب نواز شخصیت اور اُردو صحافت کی آبرو حضرت محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست" نے اپنی لامتناہی مصروفیات کے باوجود میرے کلام کا بھرپور جائزہ لیا۔ میرے اور میری شاعری کے بارے میں اُنہوں نے جو انکشافات کئے ہیں اس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ ان کا لکھا ایک ایک حرف میرے حق میں ایک دستاویز سے کم نہیں۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نہ صرف جدید رنگ کے نامور شاعر ہیں بلکہ ہندوپاک کے ممتاز اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے ہیں، انہوں نے میرے مجموعۂ کلام کا فنی بصیرت کے ساتھ مطالعہ کر کے میری شعر گوئی کا تجزیہ کیا اور تفصیلی جائزہ لیا۔ اُن کی قیمتی رائے اور جدید غزل سے وابستگی کے پس منظر میں میری شاعری کے "خدوخال" کچھ اور نمایاں ہوگئے جس کے لئے میں ڈاکٹر صاحب کا بے حد شکرگزار ہوں۔

میں اپنی یونیورسٹی کی اُستاد پروفیسر سیّدہ جعفر سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ و صدر شعبۂ اُردو حیدرآباد یونیورسٹی کا بھی شکرگزار ہوں کہ اُنہوں نے اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود "خدوخال" کے مطالعے کی زحمت گوارہ کی اور اپنی جچی تلی رائے سے نوازا۔ پروفیسر سیدہ جعفر اُردو ادب کی ایک معتبر محقّق اور نقّاد کی حیثیت سے ہندوستان گیر شہرت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر طیب انصاری کی رائے گویا میری شاعری کا ایک مکمل جائزہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف بلند پایہ ادیب ہیں بلکہ ایک اچھے محقّق اور نقّاد بھی ہیں۔ اُنہوں نے جس عرق ریزی اور خلوص کے ساتھ میری شاعری کا جائزہ لیا اور جگہ جگہ میرے اشعار بھی پیش کیے ہیں اس تفصیلی جائزے کے لئے میں اُن کا بے حد شکرگزار ہوں۔

میں اپنے عزیز دوست ممتاز شاعر جناب صلاح الدین نیّر کا دل کی گہرائیوں

کے ساتھ شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے نہ صرف میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازا بلکہ میری شخصیت، شاعری اور ادبی کاوشوں کو بھی اپنے سیر حاصل مضمون میں سمیٹ کر میرا مکمل تعارف کروایا۔

میں ڈاکٹر انورالدین ریڈر شعبۂ اُردو (حال صدر شعبۂ اُردو) حیدرآباد یونیورسٹی کا بھی شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے میرے مجموعۂ کلام پر بصیرت افروز رائے دے کر "خدوخال" کی زینت میں اضافہ کیا۔

میرے بھائی شفیع اقبال (ایڈیٹر "ہماری منزل") بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً میرا ہاتھ بٹایا اور اس کی کتابت کی ذمّہ داری بھی قبول کی۔

باکمال خوش نویس فہیم احمد کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے کہ اُنھوں نے "خدوخال" کے سرورق کو اپنی نایاب کتابت سے جاذب نظر بنا دیا۔

بڑی ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں جناب سیّد نور محمد صاحب مالک اعجاز پریس کا شکریہ ادا نہ کروں۔ میں اُن کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے کتابت سے طباعت تک کے تمام مراحل آسان کر دیئے۔

میں برِّصغیر کے نامور ترقی پسند شاعر حضرت مجروح سلطان پوری کا شکریہ ادا کیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پچھلے دنوں اُنھوں نے رویندر بھارتی حیدرآباد میں منعقدہ مشاعرہ میں شرکت کی تو دوسرے دن رِتز ہوٹل میں مجھے ملاقات کا شرف بخشا۔ "خدوخال" کے مسوّدے پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے ہوئے میرے ساتھ ایک یادگار تصویر لینے پر آمادگی ظاہر کی جو اس مجموعہ کی زینت بن سکی۔

آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کی جانب سے جزوی اعانت پر بھی میں شکر گزار ہوں کہ کتاب کی طباعت میں آسانی ہوئی۔

صادق نوید

مکان نمبر 47-3-11، سکندر فلورے جدید ملے پلی حیدرآباد 500001

حمد

خالقِ بحر و بر خالقِ دو جہاں
تیری قدرت کے شاہد زمیں آسماں

ماورائے خرد ہیں ترے کام سب
تیرے قبضے میں ہے نظمِ کون و مکاں

سارا عالم رواں ہے فنا کی طرف
تیری ہستی مگر ہستیٔ جاوداں

ہم کو یارب گناہوں سے محفوظ رکھ
کچھ نہ کچھ ہم سے ہوتی رہیں نیکیاں

قُرب اتنا کہ شہ رگ سے نزدیک ہے
جان و تن میں ہے تُو تجھ کو ڈھونڈیں کہاں

اے خدا سب کا معبودِ واحد ہے تو
کوئی تجھ سا نہیں، سب کا تُو پاسباں

قہر پر اُس کی رحمت ہے غالب نوید
اپنے بندوں پہ ہے وہ بڑا مہرباں

نعت شریف

تقدیر سے ہو جائے جو عرفانِ محمدؐ
چھوٹے نہ کبھی ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

اللہ کی تخلیق کا شہکار ہیں آقا
واللہ خدا خود ہے ثنا خوانِ محمدؐ

اک شمع ہدایت کی فروزاں ہے جہاں میں
کیا فرش سے تا عرش ہے احسانِ محمدؐ

صد شکر کہ وابستۂ دامانِ علیؓ ہوں
قائم اسی نسبت سے ہے فیضانِ محمدؐ

سرکارؐ پہ گھر بار تو کیا جان لٹا دی
اصحابِ نبیؐ سب تھے فدایانِ محمدؐ

دربار میں صف بستہ کھڑے شاہ و گدا ہیں
دیکھے تو کوئی شانِ غلامانِ محمدؐ

الفاظ نویدؔ آپؐ کی توصیف سے قاصر
اک نعت نہ ہو پائے گی شایانِ محمدؐ

نعتِ شریف



کھلتے ہیں کہاں سب پر اسرار مدینے کے
دلدار خدا کے ہیں دلدار مدینے کے

جس دل کے نگہباں ہوں سرکار مدینے کے
اُس دل پہ اُترتے ہیں انوار مدینے کے

کیا تابِ سخن مجھ میں آقا کی عنایت ہے
ہوتے ہیں رواں لب پر اشعار مدینے کے

اک طورِ تجلّی ہے ہر ذرّہ مدینے کا
خورشید بہ داماں ہیں آثار مدینے کے

در پر مرے آقا کے جب تک نہ رسائی ہو
اچھے ہی نہیں ہوں گے بیمار مدینے کے

دنیا کے گلستاں میں دیکھا بھی تو کیا دیکھا
دیکھے نہ اگر جا کر گلزار مدینے کے

دیکھا تو نہیں لیکن اکثر میری آنکھوں میں
پھرتے ہیں گلی کوچے بازار مدینے کے

اِک شمع ہدایت کی روشن ہے قیامت تک
ہر سمت برستے ہیں انوار مدینے کے

خاکِ درِ آقا پر دم نکلے نوید اپنا
ہمسایہ لحد کے ہوں گھر دار مدینے کے

—٭—

نعت شریف

کسی بشر میں کہاں اُن کی بات آتی ہے
رسولِ پاکؐ کا ہر وصف معجزاتی ہے

رواں ہے جلوۂ احمدؐ کے نور کا دریا
یہ کائنات اِسی نور میں نہاتی ہے

ستم کے تیر چلا کر روایتاً دُنیا
نبیؐ کے چاہنے والوں کو آزماتی ہے

حضورِ پاک کی اُلفت ہے حاصلِ ایماں
اُنہیں کی یاد میں ہر سانس آتی جاتی ہے

تڑپ ہو دل میں تو اسباب خود ہی بنتے ہیں
درِ نبیؐ پہ عقیدت ہی کھینچ لاتی ہے

خدا کا نور برستا ہے اہلِ محفل پر
جہاں بھی نعت کی محفل سجائی جاتی ہے

نبیؐ کا ذکر عبادت نہیں تو کیا ہے نوید
یہ نعتِ پاک تو ایمان کو بڑھاتی ہے

نذرِ حسینؑ



نہیں کلام کہ بس حق کی جستجو ہے حسینؑ
اگر گلاب ہے ایماں تو رنگ و بو ہے حسینؑ

وقارِ زیست ہے انسانیت کا محسن ہے
پیامِ حق ہے محبّت کی گفتگو ہے حسینؑ

زبانِ حال سے تاریخ اعتراف کرے
کہ بزم و رزم کی بیشک وہ آبرو ہے حسینؑ

یزیدِ وقت بھی سر آپ کا جھکا نہ سکا
ہر ایک دشمنِ ایماں کے دو بدو ہے حسینؑ

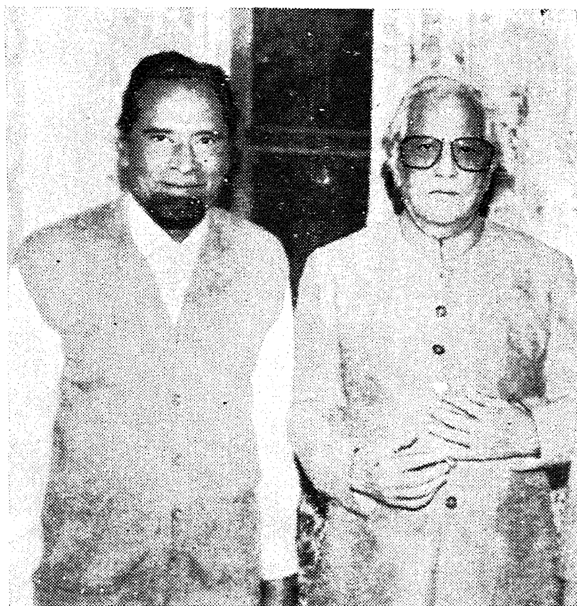
ہوائے نفس پہ جو بھی چلا یزید بنا
یزیدیت کے مٹانے کو رو برو ہے حسینؑ

چمن چمن ہے شہیدانِ کربلا کی مہک
دلِ فسردہ میں مانندِ مشک بُو ہے حسینؑ

رضائے حق کے لئے حق کی دوستی کے لئے
ہر ایک بزم میں شامل ہے کُو بہ کُو ہے حسینؑ

تمام عمر جو بس حالتِ نماز میں تھا
خدا کی راہ میں سر دے کے سُرخ رُو ہے حسینؑ

وہ لڑ رہا تھا اندھیروں سے روشنی کے لئے
نویدِ صبحِ مسرت کی آرزو ہے حسینؑ



دادا پھالکے اوارڈ یافتہ فلمی نغمہ نگار، نامور ترقی پسند شاعر
جناب مجروح سلطان پوری کے ساتھ صادق نوید کی ایک یادگار تصویر



ماضی پہ مسکرا کے مرا حال لے گئے

وہ مجھ سے مل کے میرے خدوخال لے گئے



شائد اسی رستے سے گزرا اُس کا ہُوا تھا
کل رات مرے ذہن کا دروازہ کھُلا تھا

ہر سمت نظر آئے مجھے اجنبی چہرے
ایک ایک سے میں اپنا پتہ پُوچھ رہا تھا

کچھ سوچ کے خاموش رہا میں سرِ محفل
ورنہ ترے اخلاص پہ حرف آہی گیا تھا

پتھر یہ بڑی دُور سے کس شوخ نے پھینکا
ساگر کے کنارے میں کھڑا سوچ رہا تھا

جب غم کی کڑی دھوپ تھی سنگین تھے حالات
سایہ بھی مرا مجھ سے بہت دُور کھڑا تھا

جس موڑ پہ یادوں کے دیئے تم نے بجھائے
دیکھا تو وہاں ایک دِیا اور جلا تھا

اس طرح نوید اب کے بہار آکے گئی ہے
جیسے کسی صحرا میں کوئی پھُول کھِلا تھا



دل کی ویران گزرگاہ میں آتے رہیئے
اک نہ اک غم کی نئی فصل اُگاتے رہیئے

بزمِ تخئیل بہر طور سجاتے رہیئے
کوئی تصویر ہو تصویر بناتے رہیئے

آتی جاتی ہوئی سانسوں کا تقاضہ ہے یہی
زندگی قرضِ مسلسل ہے چُکاتے رہیئے

زندگی کو جو نہ سمجھے تو بڑا بوجھ ہے یہ
بوجھ اُٹھانا ہی اگر ہے تو اُٹھاتے رہیئے

صحرا صحرا نہ بکھر جائے کہیں اپنا وجود
مجھ کو آپ اپنا پتہ یاد دلاتے رہیئے

بھیگی بھیگی ہوئی پلکوں پہ تمنّا کے چراغ
شام تا صبح اندھیروں میں جلاتے رہیئے

گُل کی چاہت ہے تو کانٹوں پہ بھی چلنا ہے نویدؔ
غیر تو غیر عدو سے بھی نبھاتے رہیئے



نطق کا ہے جو تعلق لبِ اظہار کے ساتھ
بس قلم کا یہی رشتہ ہے قلمکار کے ساتھ

صرف تخلیق ہی کافی ہے تعارف کے لئے
کوئی گھر گھر نہیں جاتا کسی اخبار کے ساتھ

آپ اپنے ہی پرستاروں سے اُلجھا نہ کریں
بات ہوتی ہے محبت کی خریدار کے ساتھ

اُن سے ہوتی جو ملاقات تو کچھ بات بھی تھی
کوئی کیا بات کرے گا در و دیوار کے ساتھ

عقل کو دخل بہت کچھ ہے نئی دُنیا میں
دل کے دیرینہ روابط سہی دلدار کے ساتھ

دوستی کر کے نبھانا ہے کوئی کھیل نہیں
دو قدم چل کے دکھاؤ کسی غمخوار کے ساتھ

اپنی تخلیق سے باہر نہیں فنکار نوید
میری پہچان بنی ہے مرے اشعار کے ساتھ



جب دل مہک مہک اُٹھے گلزار کی طرح
ہر سانس ہمکلام ہو دِلدار کی طرح
سُلجھے ہوئے خیال کے پیکر تراشیئے
اُلجھے نہ کوئی لفظ کسی خار کی طرح

کیونکر کہوں کہ اُس نے نہ دیکھا مری طرف
وہ دیکھتا تو ہے مگر اغیار کی طرح

اُس بے وفا کو جانِ وفا میں اگر کہوں
وہ سر ہلا نہ دے کہیں اِنکار کی طرح

مانا کہ تیز گام ہیں اتنے سُبک نہیں
نکلیں حصارِ ذات سے رفتار کی طرح

ہرگز کتابِ دل نہ سرِ عام کھولنا
پڑھ لیں گے حرف حرف وہ اخبار کی طرح

شائد کہ دل پہ ہے کوئی قبضہ کئے ہوئے
صادق نوید آپ کے اشعار کی طرح



ماضی پہ مسکرا کے مرا حال لے گئے
وہ مجھ سے مل کے میرے خد و خال لے گئے

تفصیل سے وہ دیکھ نہ پائے کتابِ دل
بس اک نگاہ ڈال کے اجمال لے گئے

کچھ اور لے کے جا نہ سکے اس جہاں سے ہم
سرمایہ اُٹھا کے اپنے ہی اعمال لے گئے

ناداں سمجھ سکے نہ مقامِ نشاطِ غم
جھوٹی خوشی سمیٹ کے کنگال لے گئے

جب ہو سکی نہ اُن کی کوئی چال کامیاب
آئے شکاری اور نئے جال لے گئے

آئے کئی لباس بدل کر ستم کے دن
جو کچھ وہ چاہتے تھے بہر حال لے گئے

اب سمائے حیات میں کیا رہ گیا نوید
وہ کیا گئے کہ لطفِ مہ و سال لے گئے



مانا کہ زمانے کی ہے آب و ہوا میلی
ہم ہونے نہیں دیں گے آپس کی فضا میلی

کیا حال رقم کرتے ہم شہرِ تمنّا کا
اُلفت کی جگہ نفرت، تہذیبِ وفا میلی

اِخلاص کے ہونٹوں پر زہریلا تبسّم ہے
ہر نور کے پیکر نے پہنی ہے قبا میلی

آسان بھی مشکل بھی، ہر شخص کا دل رکھنا
دل سے جو نکل جائے ہوگی نہ دُعا میلی

گلفام حسینوں کی بے باک اداؤں سے
ملتی ہے خوشی لیکن ہوتی ہے حیا میلی

آپ اپنی کہانی پر یوں اشک فشانی سے
دُھلتی ہیں اگر آنکھیں ہوتی ہیں سوا میلی

کہتے ہیں نوید اپنا لہجہ ہے جُدا سب سے
ہم کیسے روا رکھتے اِک طرزِ ادا میلی



بکھرے ادب حرف تو خانوں میں بٹ گئے
اہلِ قلم، قلم کی دکانوں میں بٹ گئے

کہنے کو ایک جیسے ہیں دنیا کے آدمی
لیکن سب اپنی اپنی زبانوں میں بٹ گئے

زندہ حقیقتوں کی طرف دیکھتا ہے کون
اذہان جھوٹ سچ کے فسانوں میں بٹ گئے

اتنے سبک ہوئے کہ زمیں پر نہ ٹک سکے
بے خانماں پرند اڑانوں میں بٹ گئے

اب کس کو یاد رکھیں کسے بھول جائیں ہم
چہرے تمام آئینہ خانوں میں بٹ گئے

شاہین اپنے دور کے بے پر ہوئے نوید
سب لامکاں سے ہٹ کے مکانوں میں بٹ گئے



دشتِ جنوں میں کوئی نہ رہبر ملا مجھے
خود اپنی لغزشوں نے سہارا دیا مجھے

اِک اجنبی سا آج بھی ہوں اپنے شہر میں
فرصت کِسے یہاں کہ کوئی کھوجتا مجھے

مجھ کو بہت دِنوں سے خود اپنی تلاش ہے
اے کاش مِل سکے کہیں اپنا پتا مجھے

گلشن کی شب گزیدہ فضاؤں کی خیر ہو
اب اشتیاقِ صبح نہ بادِ صبا مجھے

شائد مرا وجود بھی خانوں میں بٹ گیا
میرے قریب آکے کوئی دیکھتا مجھے

اس حسنِ انتظام کے قربان جائیے
وہ خود تو چھاؤں میں ہیں نہیں آسرا مجھے

آئینۂ حیات ہے اپنی غزل نوید
ہے آرزوئے داد نہ فکرِ صلہ مجھے



اک ایسی راہ کہ جس پہ کوئی چلا ہی نہ ہو
کہیں وہ میرا پسندیدہ راستا ہی نہ ہو

اُسی چراغ سے روشن ہے خانۂ ہستی
ہزار بادِ مخالف سے جو بجھا ہی نہ ہو

میں زخمِ زخمِ تمنّا کے لب نہ کھولوں گا
مِلے وہ درد کہ جس کی کوئی دوا ہی نہ ہو

تو سب میں رہ کے جُدا ہے اک اجنبی کی طرح
کِسی سے جیسے کوئی تیرا واسطا ہی نہ ہو

وہ شخص کتنا بڑا ہے، عظیم انساں ہے
اگر ضمیر کا سودا کبھی کیا ہی نہ ہو

اُسی پہ آئے نہ الزام بے وفائی کا
جو تیری بزم سے اُٹھ کر کہیں گیا ہی نہ ہو

شعور و فِکر میں وسعت ہے عصرِ نو کی نوید
یہ منفرد لب و لہجہ کہیں نیا ہی نہ ہو



سایہ دار اک شجر نہیں ملتا
گھر سے نکلیں تو گھر نہیں ملتا

یوں تو آبادیوں کے جنگل میں
آدمی ہے مگر نہیں ملتا

شور، فتنہ، فساد، بے چینی
پر سکوں اک نگر نہیں ملتا

کیفیت اس کی مل تو جاتی ہے
کیا ہوا وہ اگر نہیں ملتا

جسم و جاں کی یہ فصل کیسی ہے
جس میں کوسوں بشر نہیں ملتا

فتح کر لے دلوں کو جب چاہے
سب کو ایسا ہنر نہیں ملتا

ایسی تخلیق درد سر ہے نوید
جس میں خونِ جگر نہیں ملتا



غمِ حیات مسلسل عذاب جیسا تھا
ہمارا دورِ پریشان خواب جیسا تھا

بھٹک کے رہ گئے گم گشتہ آرزو کی طرح
وگرنہ زیست کا مقصد ثواب جیسا تھا

ہمارا حال کسی پستہ قد پہ کیا کھلتا
بلند طاق پہ رکھی کتاب جیسا تھا

سراپا اُن کا لچکدار شاخِ گُل کی طرح
حسین چہرہ شگفتہ گلاب جیسا تھا

لبوں پہ رقصِ تبسم، خمار آنکھوں میں
جمالِ یار مجسم شراب جیسا تھا

وہ خود کو ڈھونڈ رہے تھے ہماری آنکھوں میں
شکستِ خواب کا عالم بھی خواب جیسا تھا

سب اپنے چہروں کی پہچان کھو چکے تھے نوید
ہر ایک شخص کے رُخ پر نقاب جیسا تھا



مرا وجود بھی جب گمشدہ لگے ہے مجھے
تری نگاہ سے اپنا پتہ لگے ہے مجھے

قبول کہ تو مرے پاس ہے گویا
یہ فاصلہ بھی بڑا فاصلہ لگے ہے مجھے

قدم کی چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے
نفس نفس تری آوازِ پا لگے ہے مجھے

پلا رہا ہے کوئی مجھ کو اپنی آنکھوں سے
وہ چشمِ مست بھی اک میکدہ لگے ہے مجھے

میں بھول جاؤں تجھے میرے بس کی بات نہیں
یہ بات تو بھی کہے تو بُرا لگے ہے مجھے

وفورِ شوق میں جب شعر گنگناتا ہوں
دل و نظر میں کوئی جھومتا لگے ہے مجھے

صفاتِ گُل ہیں الگ، رنگ و بُو جُدا ہے نوید
چمن کے پھول سبھی خوشنما لگے ہے



وہ اشک خونِ تمنّا جو دل کے اندر تھا
خِرد کی آنکھ سے ٹپکا تو اِک سمندر تھا

کچھ احتیاط، نہ درباں، نہ زحمتِ دستک
کہ اپنے دل کا ہمیشہ کھُلا ہوا دَر تھا

وہ جس کو رَوند کے تم نے محل بنایا ہے
تمہیں یہ کیسے بتاؤں وہی مِرا گھر تھا

میں اپنے آپ سے چھُپ کر انا کی زد میں رہا
نہیں کسی کا نہیں، خود مجھے مرا ڈر تھا

قریب آکے وہ ہم سے مصافحہ کرتے!
ہمارے ہاتھ میں پتھر نہیں گُلِ تر تھا

بہت حسین تھا، دلچسپ خوابِ زیست نوید
کھُلی جو آنکھ تو غائب ہر ایک منظر تھا



شدتِ غم میں کچھ کمی تو ملے
ہم کو اتنی سی اِک خوشی تو ملے

قہر ہے محفلوں کی تنہائی
بات کرنے کو آدمی تو ملے

جینے والے خوشی سے مر جاتے
جینے والوں کو زندگی تو ملے

اوج پر ہے غموں کی شادابی
خشک آنکھوں میں کچھ نمی تو ملے

پھر خلش رہ گئی، نہ ملنے کی
جن سے ملنا تھا وہ کبھی تو ملے

منتشر پیکرِ خیالی کو
پیرہن کوئی کاغذی تو ملے

کتنی سنسان ہے ڈگر غم کی
راہ میں کوئی اجنبی تو ملے

شب بسر ہو گئی اندھیروں میں
صبح آئی ہے روشنی تو ملے

مژدۂ جانفزا یہی ہے نوید
مسکرا کے وہ سرسری تو ملے



یقیں ہوا کہ محبت بھی انتقام سے ہے
ہمارے نام کی شہرت تمہارے نام سے ہے

حقیقتاً تری عظمت کہاں ہے مجھ سے جُدا
تری بڑائی بھی یاروں کے اہتمام سے ہے

صدف ہے جبرِ مشیّت رواں ہے سیلِ حیات
کہ ذرّہ ذرّہ سلامت اسی نظام سے ہے

ڈھلے نہ درد کے صحرا سے اضطراب کی دُھوپ
حیاتِ گرمیِ دل کربِ ناتمام سے ہے

نہ جانے صبحِ تمنّا کا حشر کیا ہوگا
بجھا بجھا سا دیا اپنے دِل کا شام سے ہے

شکستِ شیشۂ دل بے صدا سہی لیکن
عجیب شورشِ پیہم شکستِ جام سے ہے

نہیں جو مانعِ ابلاغ تنگنائے غزل
نویدِ شوق کی ترسیل اِحتشام سے ہے



ہم جرمِ بے گناہی کا اقرار کیا کریں
ضائع کچھ اور عمرِ سبکدار کیا کریں

چوروں کا خوف ہو تو ڈھلے دن نہ رات ہو
اتنا بھی کر نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

احباب ہی ہوئے نہ ہمارے شریکِ غم
پھر بھی کریں نہ طنز تو اغیار کیا کریں

دشتِ جنوں میں حسرتِ دیوار و در لئے
سوئی ہوئی ہے عقل تو بیدار کیا کریں

مانا کہ تیرے شہر میں ہیں قدرداں بہت
ہم بے نیازِ کوچہ و بازار کیا کریں

اک بات راز کی جو سُنی، اَن سُنی ہوئی
اُس بات کا ہر ایک سے اظہار کیا کریں

سب اپنے فکر و فن کے طرفدار ہیں نوید
کہلا کے اپنے آپ کو فنکار کیا کریں



مانا کہ بس میں توسنِ عمرِ رواں نہیں
گردش میں کب زمیں نہیں آسماں نہیں

اس طرح کھل نہ جائے کہیں ضبط کا بھرم
کیجئے کئی سوال، پئے امتحاں نہیں

اندھی منافقتوں کا یہ اعجاز دیکھئے
کشتی تو چل رہی ہے مگر بادباں نہیں

دیوار کے بھی کان اگر ہوں تو کیا کہیں
یہ بھی تو ہم خیال نہیں، راز داں نہیں

احساسِ کرب، سوزِ دروں، تشنگی، گھٹن
ذکرِ غمِ حیات ہے یہ داستاں نہیں

اُن بجلیوں کی چشمکِ باہم ہے سرد سرد
جن بجلیوں کی زد میں مرا آشیاں نہیں

خود اپنے آپ سے بھی تعارف نہیں تو کیا
صادق نوید آپ کا چرچا کہاں نہیں



اَنا کو ٹھیس لگی دل کا سائباں ٹوٹا
ہوئے جو خاک نشیں سر پہ آسمان ٹوٹا

وفا کی کھوج میں اخلاص کے تجسّس میں
یہ ایک دل بھی نہ جانے کہاں کہاں ٹوٹا

رہا جو غیر کے آگے چٹان کی صورت
یہ واقعہ ہے کہ اپنوں کے درمیاں ٹوٹا

یقیں کا شہر تھا احساس کے سمندر میں
جو تو نے ڈوب کے دیکھا، ترا گماں ٹوٹا

عجیب کرب کا پتھراؤ کر رہی ہے حیات
ہر ایک جسم ہے گھائل ہر اک جواں ٹوٹا

خود اپنے دور کی تاریخ بن گئے ہم لوگ
مٹا کے ہم کو، ترا فخر آسماں ٹوٹا

قلائیں کیوں نہ معلّق نگر بسائیں نوید
خرد کا قتل ہوا، جسم کا مکاں ٹوٹا



صحرا سے نکل آیا تو بستی نے ڈبویا
مجھ کو مری انسان پرستی نے ڈبویا

یہ معرکۂ زیست کا انجام ہوا ہے
دریا نے بچایا ہے تو خشکی نے ڈبویا

احساس کے آنگن میں بڑی چھاؤں گھنی تھی
مجھ کو تری زلفوں کی سیاہی نے ڈبویا

اے حسن ترے سر کہیں الزام نہ جائے
شوخی کی قسم ہاتھ کی مہندی نے ڈبویا

منحوس ہے یہ دن، یہ گھڑی وقت بُرا ہے
قوموں کو اس اوہام پرستی نے ڈبویا

سمجھوتہ زمانے سے کبھی کر نہیں پائے
کردار کے معیار کی سختی نے ڈبویا

شہرت سے نوید آپ کو نفرت سہی لیکن
فنکار کو حالات کی پستی نے ڈبویا



ہم جس طرف اُٹھا کے نظر دیکھتے رہے
شعلوں کی زد میں اپنا ہی گھر دیکھتے رہے

ہر شاخ پہ سجا کے نیا ایک آشیاں
ہنگامہ ہائے برق و شرر دیکھتے رہے

چہرہ کھُلی کتاب تھا کچھ اس میں شک نہیں
کیا کہہ رہی تھی شوخ نظر دیکھتے رہے

اس آس میں کہ کوئی مسیحا نفس ملے
کتنے دیار، کتنے نگر دیکھتے رہے

ہوتی رہیں خلوص کے پردے میں سازشیں
ہم کب کسی کے عیب و ہُنر دیکھتے رہے

ذہنِ رسا میں فکر کا دریا تھا موجزن
کیا کیا چھُپے ہوئے تھے گہُر دیکھتے رہے

الفاظ ہی تھے وہ کوئی نشتر نہ تھے نویدؔ
پھر بھی رواں تھا خونِ جگر دیکھتے رہے



راہوں میں یوں بچھڑ کے اکیلا گزر نہ جا
اس طرح میرے یار مرے ہمسفر نہ جا

مانا کہ زندگی کے مسائل ہیں مختلف
تو زندگی کے سخت مسائل سے ڈر نہ جا

پھر ریزہ ریزہ خود کو سمیٹا نہ جا سکے
شیشے کی طرح ٹوٹ کے ایسے بکھر نہ جا

کر لے روا روی میں، نہ جانے کا فیصلہ
آنا ہے تجھ کو لوٹ کے یہ سوچ کر نہ جا

صحرا میں بس گئی ہیں ترے دم سے بستیاں
صحرا کو پھر اُجاڑ کے تو اپنے گھر نہ جا

جوہر کوئی ہے تجھ میں تو پھر سب کو کھینچ لے
تو سب کے پاس لے کے متاعِ ہنر نہ جا

مانا نظر ہے حسن کی جادو اثر نوید
پہلو سے تو نکل کے دلِ معتبر نہ جا



روح بے چین لگے ہے کسی گھائل کی طرح
لوگ آپس میں اُلجھتے ہیں مسائل کی طرح

مصلحت بن گئی جینے کی ضرورت یارو
عقل ہے محوِ تماشہ کسی جاہل کی طرح

قتل ہوتا ہو کوئی یا کوئی گھر جلتا ہو
دل مِرا ہے کہ تڑپ اُٹھتا ہے بسمل کی طرح

خدمتِ شعر و ادب کے لئے فرصت تو نہ تھی
پھر بھی یہ کام کیا ہے کسی کاہل کی طرح

رات کس منچلے پروانے کا ارماں نکلا!
شمع کیوں ہو گئی خاموش بجھے دل کی طرح

وقفے وقفے سے مِرے قتل کی دُھن ہے اسکو
کوئی قاتل تو نہ ہوگا مرے قاتل کی طرح

کتنے طوفان سمیٹے ہوئے پہلو میں نوید
مطمئن آپ رہا کرتے ہیں ساحل کی طرح



رونقِ بزمِ طرب وہ ساقیٔ گلفام ہے
ہر ادا مستانہ جس کی ہر نظر اک جام ہے

اصطلاحاً ہم بھی پی لیتے ہیں گو پیتے نہیں
چشمِ ساقی کا کرم ہے میکدے کی شام ہے

جی آرام کیسا لمحہ لمحہ ہے سفر
زندگی بے سمت راہوں کے سفر کا نام ہے

آپ اپنی راہ میں حائل ہے دیوارِ انا
درمیاں لوگوں کے اب خوش قامتی بدنام ہے

زندگی سے زندگی تک ہیں ہزاروں معرکے
موت کہتے ہیں جسے آرام ہی آرام ہے

جذبۂ علم و ہنر مانگے ہے محنت کے گہر
کوہکن بن جائیں بے تیشہ خیالِ خام ہے

محفلِ شعر و سخن کا بانکپن ہم ہیں نوید
ہم سے وابستہ ہماری شاعری کا نام ہے



اپنے بل پر زندگی بھر آپ کیا چلتے رہے
آپ کے پیچھے کئی صبح و مسا چلتے رہے

مانگ کر چہرہ کسی کا مدتوں بے چہرہ لوگ
شاعری کے دشت میں بے دست و پا چلتے رہے

منتظر تھے راہ میں کتنے حسینانِ جہاں
سر جھکائے ہم بھی مثلِ پارسا چلتے رہے

رہبری کا جن کو دعویٰ تھا نہ چلنے کا شعور
جانبِ منزل وہی بے آسرا چلتے رہے

دل کے ہاتھوں زندگی میں ہم لُٹے تھے ایک بار
اپنی بربادی کے قصے بارہا چلتے رہے

یہ ہمارا حوصلہ تھا کود کر طوفان میں
ناخدا کے آگے آگے یا خدا چلتے رہے

ہم کسی اک دائرے میں قید کیا ہوتے نوید
رہ گئے آزاد مانندِ ہوا چلتے رہے



ازل سے شکوۂ بیہم رہا ہے آنکھوں میں
غمِ حیات کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

وہ دلربا جو بہت کم رہا ہے آنکھوں میں
اُسی کا نقشِ مجسّم رہا ہے آنکھوں میں

وہ ایک حرفِ تمنّا جو لب پہ آ نہ سکا
رہا اگر تو یہی غم رہا ہے آنکھوں میں

تری نگاہ سے جب جب نگاہ ٹکرائی
حیات و موت کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

ہوا ہے حد سے سوا جب کبھی غمِ دوراں
تمھارا عکس بھی مدھم رہا ہے آنکھوں میں

لبوں پہ مہرِ وفا دل میں خوف رسوائی
کمالِ ضبط کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

یہ انتظار کی گھڑیاں یہ ہجر کا عالم
اب آبھی جا کہ مرا دم رہا ہے آنکھوں میں

نویدؔ سوزِ محبت کا یہ اثر تو نہیں
جگر سے اٹھ کے دھواں جم رہا ہے آنکھوں میں





رہتا ہوں میں جس میں وہ نگر ڈھونڈ رہا ہوں
خوابیدہ تمناؤں کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں

آپ اپنی انا سے مجھے ٹکرا کے مِلا کیا
آخر ہے وجود اپنا کدھر ڈھونڈ رہا ہوں

افکار کے شعلوں کی تمازت سے نِکل کر
احساس کے آنگن میں شجر ڈھونڈ رہا ہوں

مجھ میں تمھاری ذات کا پیکر کبھی زندہ
اب اُس کو میں با دیدۂ تر ڈھونڈ رہا ہوں

یاد اتنا تو ہے عزمِ سفر لے کے چلا تھا
وہ میرے ہے کہاں، رہگزر ڈھونڈ رہا ہوں

اک بار عنایت کی نظر مجھ پہ ہوئی تھی
پھر ویسی نظر، بارِ دگر ڈھونڈ رہا ہوں

چہروں سے بھرے جسم کے جنگل میں نوید اب
مِلتا نہیں انسان، مگر ڈھونڈ رہا ہوں



اس قدر ہے اہتمامِ زندگی
زہر پیتے ہیں بنامِ زندگی

لے رہے ہیں زندگی کے نام پر
زندگی سے انتقامِ زندگی

صبح گزری کیسی اُمیدوں کے ساتھ
آگئی ہے اب تو شامِ زندگی

ہم کہ معتوبِ جہاں بربادِ زیست
دیتے آئے ہیں پیامِ زندگی

وقت کے تیور سے اندازہ کرو
کتنا برہم ہے نظامِ زندگی

ہم حبابوں کی طرح زندہ رہے
بن کے کیا رہتے غلامِ زندگی

پینے والوں کو نگاہوں سے پلا
ساقیا! بھر بھر کے جامِ زندگی

سب پہ کب کھلتے ہیں اسرارِ حیات
کیا کہیں کیا ہے مقامِ زندگی

چلتی پھرتی لاش ہیں گویا نوید
ہے برائے نام، نامِ زندگی



بار ہا زہرِ غم پیا ہم نے
تازگیِ رُخِ جہاں کے لیئے

زندگی دربدر بھٹکتی ہے
آج بھی صبحِ ضو فشاں کے لیئے

کب سے محوِ تلاشِ عنواں ہوں
اپنی بے نام داستاں کے لیئے

تنگ ہے ارضِ وسعتِ دنیا
ایک آوارۂ جہاں کے لیئے

مرہمِ چشمِ صد مسیحائی
اِک مداوائے زخمِ جاں کے لیئے

بن گیا ہوں چراغِ راہ گزر
اپنے گم گشتہ کارواں کے لیئے

اپنی عمرِ گراں ہے وقف نوید
جذبۂ ذوقِ کامراں کے لیئے

(غزل ۸۲ء



آنکھیں پُرنم ، زُلفیں برہم
پچھلی شب ، برسات کا موسم

بکھرے بکھرے گیسو جیسے
سارا عالم ، درہم برہم

دِل کے اِشارے کوئی نہ جانے
جیسے ہلکے ، مُبہم مُبہم

زیست کی راہیں ایسی راہیں
جیسے زُلفوں کے پیچ و خم

میری دُنیا غم کی دُنیا
میرا غم ہے دُنیا کا غم

ہو گئے آخر دریا دریا
قطرہ قطرہ اشکِ پیہم

عِشق نوید اک تلخ حقیقت
حُسن کا جادو عالم عالم



بیمارِ محبت پہ کرم کیوں نہیں کرتے
جب درد بڑھایا ہے تو کم کیوں نہیں کرتے

تعمیلِ تقاضائے قلم کیوں نہیں کرتے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کیوں نہیں کرتے

ہر ایک کو یکساں بہ نظر دیکھنے والے
ہم پر بھی کبھی چشمِ کرم کیوں نہیں کرتے

بے وجہ غمِ دل کی حکایات نہ پوچھو
غمخوار ہو، اندازۂ غم کیوں نہیں کرتے

یہ کالی گھٹا اور یہ موسم کے اشارے
پھر تذکرۂ ساغرِ جم کیوں نہیں کرتے

اے درد کے ماروں سے نظر پھیرنے والو
انسان ہو انسان کا غم کیوں نہیں کرتے

محبوبِ نوید آپ کہاں اور کہاں ہم
اسبابِ ملاقات بہم کیوں نہیں کرتے



داستاں داستاں کچھ نہیں
ذکر تیرا جہاں کچھ نہیں

صحرا صحرا پکارا ہے
کارواں، کارواں کچھ نہیں

منزلِ شوق یک گام ہے
فاصلہ درمیاں کچھ نہیں

تو اگر مہرباں ہے تو پھر
وقت کا اِمتحاں کچھ نہیں

پھول کھلتے ہی مرجھا گئے
گلستاں گلستاں کچھ نہیں

بجلیاں مہرباں ہو گئیں
آشیاں آشیاں کچھ نہیں

فکرِ انساں کے آگے نوید
رفعتِ آسماں کچھ نہیں



جس کو دیکھو اپنے اپنے فن میں یکتا ہو گیا
آج ہر فنکار کو ایسا ہی دھوکا ہو گیا

اِس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کمالِ گمرہی
وہ جو خود بیمار ہے سب کا مسیحا ہو گیا

جس کو کندھوں پر اُٹھایا ہم نے ازراہِ خلوص
اُس نے یہ سمجھا کہ میں بھی سب سے اُونچا ہو گیا

بے سبب ہم بھی مزاجِ دہر سے نالاں نہیں
زندگی کے پیچ و خم کا تجربہ بتا ہو گیا

مثلِ کوزہ تھا حصارِ جسم میں اپنا وجود
رفتہ رفتہ پھیل کر وسعت میں دریا ہو گیا

دل کے زخموں کی مسیحائی، نہیں ممکن نہیں
زخم اک اچھا ہوا اک زخم گہرا ہو گیا

ناقدانِ وقت بھی کیونکر یہ سمجھیں گے نوید
وہ بڑا شاعر ہے، گھر گھر جس کا چرچا ہو گیا



قلبِ سوزاں کی تپش دیدۂ خونبار کی بات
کیا سناؤں میں تمہیں اپنے دلِ زار کی بات

ذکرِ لبِ مہوشِ اربابِ چمن کیا کیجئے
پھول سے دل پہ گراں ہو نہ کہیں خار کی بات

ہاں سرِ بزم کہی ہیں تو یہی دو باتیں
کبھی دلدار کی بات اور کبھی دار کی بات

ہم وہی ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
ہم سے منسوب ہوئی عظمتِ کردار کی بات

یوں تو آساں ہے ہر اک مرحلۂ زیست مگر
ہے جو دشوار بہت، وہ ہے ترے پیار کی بات

بات کرنے کا سلیقہ ہو، بڑی بات ہے یہ
اہلِ دل کی ہو کوئی بات کہ دلدار کی بات

بامِ افلاک پہ انسان کی پروازِ نوید
مظہرِ ہوش و خرد، جذبۂ بیدار کی بات



عشقِ رُسوا کو جنونِ فتنہ ساماں مِل گیا
خیر ہو اب دستِ وحشت کو گریباں مِل گیا

یوں سِمٹ آئے دلِ صد چاک میں یادوں کے پھول
جیسے اک برباد صحرا کو گلستاں مِل گیا

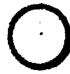
اے غمِ دوراں یہی کیا کم نوازش ہے تری
پھر غمِ جاناں بشکلِ دردِ انساں مِل گیا

خلوتِ دل کو مِلا ہے تحفۂ سوز و گداز
ہر شکستہ آرزو کو قلبِ ویراں مِل گیا

ماورائے کہکشاں ہے منزلِ ذوقِ نظر
دیدۂ بینا کو نورِ ماہِ تاباں مِل گیا

آخرِ شب کے سِسکتے ماہ و انجم کی قسم
اک بُجھے دل کو چراغِ داغِ ہجراں مِل گیا

چونک اُٹھتا ہوں خود اپنے دل کی دھڑکن پر نوید
زندگانی کو مری خوابِ پریشاں مِل گیا



حیاتِ بیکراں ہے اور میں ہوں
یہ قیدِ جسم و جاں ہے اور میں ہوں

وہی ذکرِ بُتاں ہے اور میں ہوں
مرا طرزِ بیاں ہے اور میں ہوں

نہیں ہو تم مگر اب تک لبوں پر
تمھاری داستاں ہے اور میں ہوں

تمہیں کھو کر متاعِ درد پایا
یہی سُود و زیاں ہے اور میں ہوں

ستم ہے برق کی نظروں کا مرکز
مرا ہی آشیاں ہے اور میں ہوں

تخیل کی فراوانی نہ پوچھو
یہ بحرِ بیکراں ہے اور میں ہوں

نوید اب تک اسیرِ ظلمتِ شب
یہ لیلائے جہاں ہے اور میں ہوں



بے سبب دل بجھا بجھا تو نہیں
شکوۂ آہِ نارسا تو نہیں

بات کیا ہے کہ کھوئے کھوئے ہو
زندگی میں کوئی خلاء تو نہیں

بدگماں بدگماں سا رہتا ہے
حسن کی یہ بھی اِک ادا تو نہیں

آدمی آدمی کا دشمن ہے
یہ جہالت کی انتہا تو نہیں

آپ کیوں کر جفا سے باز آئیں
ہم نے شکوہ کبھی کیا تو نہیں

کس سے پوچھیں کہاں تلاش کریں
اُس نے اپنا پتہ دیا تو نہیں

ایک مخصوص رنگ میں کہنا
اپنی فطرت کا اقتضا تو نہیں

تیرا ثانی نہیں، تو یکتا ہے
اپنا محبوب دوسرا تو نہیں

جس کو صادق نوید کہتے ہیں
یہ وہی مردِ پارسا تو نہیں



میں نے مانا کہ وہ ہے جور و جفا میں تنہا
میں بھی ہوں شیوۂ تسلیم و رضا میں تنہا

کوئی ساتھی کوئی مونس کوئی غمخوار نہیں
ایسے لگتا ہے کہ ہوں راہِ خدا میں تنہا

وہ تو اظہارِ وفا کر کے گنہ گار ہوئے
میں ہی خاموش رہا اہلِ وفا میں تنہا

میرے اشعار میں شامل ہے مرے دل کا لہو
مجھ کو پاؤ گے مری فکرِ رسا میں تنہا

اس لئے ہاتھ ترے ساتھ اُٹھا لیتا ہوں
کھو نہ جائے تو کہیں دستِ دعا میں تنہا

مجھ کو یہ ناز کہ منظورِ نظر ہوں تیرا
تجھ کو یہ زعم کہ تو حسن و ادا میں تنہا

دل سے نکلا ہے وہی نغمۂ مجروح نوید
درد بن کر جو رہا اپنی صدا میں تنہا



صدائے امن لگا کر جو حق پسند چلے
فضائے دہر پہ چھا کر وہ سربلند چلے

زباں پہ حرفِ شکایت نہ دل میں کوئی خلش
تمھاری بزم سے چُپ چاپ دردمند چلے

ہمارے عشق کا عالم عجیب عالم ہے
رہِ جنوں پہ چلے بھی تو ہوشمند چلے

ہر عیب اُن کا ہُنر ہے تو پھر بُرا کیا ہے
جہاں میں اُن کی ہر اِک بات من پسند چلے

کہاں کہاں نہ ہوا میری جستجو کا گزر
کہاں کہاں نہ مری فکر کے کمند چلے

سرورِ جلوۂ جاناں میں ہوش گم ہیں نوید
نگاہِ شوق کے کیا سِ[illegible] بلند چلے



چرچا ترے جلوؤں کا لبِ بام بہت ہے
اے حُسن ترے سر ہی الزام بہت ہے

بے نام سا اِک درد ہے بے کیف سا اِک کیف
مجھ کو تری چاہت کا یہ اِنعام بہت ہے

ہونٹوں کو نہ دو اِذنِ تکلّم جو نہ چاہو
آنکھوں سے جو مِل جائے وہ پیغام بہت ہے

ہر روز نیا زخم ہے، ہر روز نیا غم
اِحسان تِرا گردشِ ایّام بہت ہے

اِک لغزشِ مستانہ ہے آغازِ محبّت
پُرسوز مگر عشق کا انجام بہت ہے

ہر آن ہے دل پر مرے، اِک تازہ جراحت
ہوں [illegible] سے میں تکلیف میں آرام بہت ہے

مائل بہ عنایت ہے نوید اُن کا تغافل
سرمایۂ غم حسرتِ ناکام بہت ہے



نئے دھارے میں انساں بہہ رہا ہے
وہ اِک طوفاں سے زور آزما ہے
جسے دیوانہ کہہ کر ٹالتے ہو
نہ جانے دل میں کیا کیا سوچتا ہے

وہی تو اک نشانِ رہگذر تھا
زمانے نے جسے ٹھکرا دیا ہے
اُسی کی زندگی ہو شام آگیں
سحر کو جس نے خونِ دل دیا ہے

تخیّل کو نیا آہنگ دے دیں
تقاضائے شعورِ ارتقا ہے

زمانے کی مسلسل بے رُخی سے
چراغِ زندگانی بجھ گیا ہے
نوید اب نطق کے کیا گُل کھلائیں
مذاقِ گلستاں بدلا ہوا ہے



کہتے ہیں کوئی رہبرِ کامل نہیں ہوتا
جب تک کہ چراغِ رہِ منزل نہیں ہوتا

اندھوں کی طرح آپ ہی ٹکراتے ہیں پتھر
آئینے کا آئینہ مقابل نہیں ہوتا

حالات کے پتھراؤ میں خاموش کھڑا ہوں
میں خود بھی مرے حال میں شامل نہیں ہوتا

وہ خاک غمِ عشق کے مفہوم کو سمجھے
عرفانِ محبت جسے حاصل نہیں ہوتا

دانستہ جو طوفان سے وابستہ رہا ہو
اچھا ہے کہ شرمندۂ ساحل نہیں ہوتا



وہ مِل کر بھی نہیں ملتے کِسی سے
نہ جانے ہو گئے کیوں اجنبی سے

بہت پُرکیف فصلِ گُل ہے لیکن
سہم جاتا ہوں کلیوں کی ہنسی سے

شعور اپنا ہی جب خود رہنما ہو
ملے گا کیا کسی کی رہبری سے

جنھیں دعویٰ تھا بینائی پہ اپنی
وہ گھبرانے لگے ہیں روشنی سے

نگاہیں اتفاقاً لڑ گئیں ہیں
کوئی مرتا نہیں اپنی خوشی سے

فرازِ عرش کو چھونے لگا ہے
توقع ہے بہت کچھ آدمی سے

نوید اپنا لب و لہجہ غزل کا
عبارت ہے ہماری شاعری سے



بھڑکا ہوا ہے آگ کا شعلہ کہیں کہیں
یا جل رہا ہے درد کا صحرا کہیں کہیں

قندیلِ چشمِ شوق کی لَو تیز کیجئے
شائد دکھائی دے وہی چہرا کہیں کہیں

جگنو کی روشنی ہے کہ اُمید کی کرن
ہونے لگا ہے کچھ تو اُجالا کہیں کہیں

گردش میں روز و شب ہیں سفر میں ہے زندگی
ہوتا ہے دو گھڑی کو بسیرا کہیں کہیں

پگھلے ہوئے ہیں جسم غموں کے الاؤ میں
بہتا ہوا ہے آگ کا دریا کہیں کہیں

لفظوں کے پیرہن میں ذرا دیکھئے بغور
اُلجھا ہوا ہے حرفِ تمنّا کہیں کہیں

صادق نوید تذکرۂ فکر و فن کے ساتھ
ہونے لگا ہے آپ کا چرچا کہیں کہیں



خود کی تشہیر پہ مائل جو طبیعت نہ ہوئی
کوئی چرچا نہ ہوا نام کی شہرت نہ ہوئی

دل ہے کعبہ تو کسی دل کو نہ ڈھایا جائے
اس سے بڑھ کر تو کوئی اور عبادت نہ ہوئی

تجھ کو اے دل کے مکیں ٹوٹ کے چاہا ہم نے
تجھ کو چاہا تو کسی اور کی چاہت نہ ہوئی

یوں تو ہر زخم کو سینے سے لگا رکھا ہے
تشنگی اور بڑھی، درد میں شدت نہ ہوئی

یہ بھی کیا کم ہے کہ تم نے ہمیں پہچان لیا
ہم کو خود اپنے تعارف کی ضرورت نہ ہوئی

اپنی خودداری طبیعت سے نہیں کوئی گلہ
یوں بھی دریوزہ گری کی ہمیں عادت نہ ہوئی



بے اثر جب ہوا اشارا بھی
ہم نے اُس کو بہت پکارا بھی

کیا بتائیں کہ زندگی کیا ہے
یہ گوارا نہیں، گوارا بھی

خوف، دہشت، ہراس، عُریانی
آج کا المیہ، نظارا بھی

شاعری اور ادب پہ لوگوں کا
کچھ اِجارا نہیں اِجارا بھی

حُسن کو کیا ضرورتِ تشبیہ
کیوں ہو درکار اِستعارا بھی

بالارادہ غزل کے گیسو کو
کچھ سنوارا نہیں سنوارا بھی

تم تو صادق نوید شاعر ہو
نام گمنام سا تمھارا بھی



کچھ تو وفا کی لاج رہے آبرو رہے
احساس کی جبیں سے ٹپکتا لہو رہے

کتنا ہی دلفریب سہی، خوشنما سہی
ہم اُس کو گُل کہیں گے اگر رنگ و بُو رہے

ہم زندگی کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیں
ہر لمحہ فکر و فن کی یہی جستجو رہے

اُردو ہے اپنے دیس کے ہر فرد کی زباں
ہر فرد کی زباں پہ یہی گفتگو رہے

طرزِ ادا کی مے جو پلائی انیسؔ نے
گردش میں تا ابد وہی جام و سبو رہے

صحرائے دل میں اُس کو بُلایا ہے اس لئے
شائد کہ دل سے، دل کی کوئی گفتگو رہے

ترکِ تعلقات سے کیا فائدہ نویدؔ
کی بند میں نے آنکھ تو وہ رُوبرو رہے



ہٹا دی ذہنِ تازہ سے ردائے تیرگی ہم نے
بیاضِ شب میں ٹانکی ہے سخن کی چاندنی ہم نے

نیا موضوع نیا لہجہ کھڑا ہے فن کی چوٹی پر
جو رُت بدلی، بدل ڈالا لباسِ شاعری ہم نے

یہ اک انعامِ قدرت ہے جو سچ پوچھو تو خلعت ہے
جتن سے پہن رکھی ہے قبائے زندگی ہم نے

گُلِ لالہ دکھاتا ہے جو اپنا داغ کلیوں کو
اُسی سے سیکھ لی شاید ادائے بے کلی ہم نے

الٰہی چشمِ عاشق میں یہ کیسا حسن پنہاں ہے
دیارِ حُسن میں دیکھی نہ ایسی دلکشی ہم نے

تفکر ہے، تعمق ہے، دبے لہجے میں سب کچھ ہے
سخن میں تیرے پائی ہے بظاہر سادگی ہم نے

نویدِ جانفزا سُن لے، بہارِ بے خزاں ہوں میں
نہ سمجھا زندگانی کو سزائے زندگی ہم نے



کرو ضرور، مگر خامشی کی بات کرو
اس احتیاط سے یارو کسی کی بات کرو

کسی طرح مرے ہمدم یہ غم کی رات کٹے
سحر کی بات کرو، روشنی کی بات کرو

اگر غرورِ تکلّم تمہیں اجازت دے
مرے حضور کبھی سادگی کی بات کرو

بہ فیضِ عقل و جنوں زندگی کے عنواں پر
خودی کی بات کرو، بے خودی کی بات کرو

شعورِ زیست کے بھرپور اعتماد کے ساتھ
نئی بہار، نئی زندگی کی بات کرو

حصارِ ذات کے کوزے سے سر اٹھا کے کبھی
کسی کے ذوق کی بہتی ندی کی بات کرو

خرد کے آگے ستارے بھی سرنگوں ہیں نوید
تم اپنے دور کی اپنی صدی کی بات کرو



حادثو آؤ تم سے پیار کریں
اب نہ تم زحمتِ قرار کریں

دولتِ دردوغم کو ٹھکرا کر
زندگی کو نہ سوگوار کریں

دل کا صحرا بھی رشکِ گلشن ہو
دو گھڑی ہم اگر قرار کریں

جانے کیا شئے ہے اُنکی آنکھوں میں
جس کو چاہیں وہ بادہ خوار کریں

جرمِ اُلفت کے ہم بھی مجرم ہیں
آپ چاہیں تو سنگسار کریں

دل کی بے نام خامشی کو نوید
قصرِ تنہائی کا حصار کریں



ہر خوشی برباد غمناکی بہت
زندگی سے زندگی شاکی بہت

کاش مل جائے کوئی انساں کہیں
بستی بستی آدمِ خاکی بہت

حسن میں بس رہ گئی اتنی کمی
اک حیا کم، اور بے باکی بہت

آدمی کے خوں کا پیاسا آدمی
آدمیّت کم ہے سفّاکی بہت

اپنے مطلب کے ہیں دیوانے سبھی
بچے بچے میں ہے چالاکی بہت



سایۂ شجر نگاہ میں تھا
چلئے اک ہمسفر تو راہ میں تھا

ہوش میں رہ کے ہوش کھو بیٹھے
دل ہمارا کسی کی چاہ میں تھا

کاش ہوتا نہ شجرِ ممنوعہ
لطفِ دنیا بس اک گناہ میں تھا

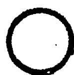
اب کہاں زندگی میں رعنائی
بانکپن سارا کج کلاہ میں تھا

روز افزوں کئی مصائب کا
سلسلہ اِک دلِ تباہ میں تھا

گو رہے خاکسار دھرتی پر
ذہن تسخیرِ مہر و ماہ میں تھا

آپ جب تک غزل سراتھے نوید
اک عجب لطف واہ واہ میں تھا

(تمام تر مطلعوں پر مشتمل)



ظلمت یہ، تیرگی پہ کبھی تبصرہ کرو
سورج کی روشنی پہ کبھی تبصرہ کرو

گر ہو سکے کلی پہ کبھی تبصرہ کرو
اُس کی شگفتگی پہ کبھی تبصرہ کرو

دل کی شکستگی پہ کبھی تبصرہ کرو
غنچے کی نازکی پہ کبھی تبصرہ کرو

بے چہرہ آدمی پہ کبھی تبصرہ کرو
آپ اپنی بے بسی پہ کبھی تبصرہ کرو

فطرت کی شاعری پہ کبھی تبصرہ کرو
بے نام سی خوشی پہ کبھی تبصرہ کرو

بُت بن کے، بُت گری پہ کبھی تبصرہ کرو
اِس رسمِ آزری پہ کبھی تبصرہ کرو

چاہو جسے اُسی پہ کبھی تبصرہ کرو
صادق نویدؔ ہی پہ کبھی تبصرہ کرو



کچھ ایسے ناز و ادا سے وہ خوش جمال گیا
سراپا اُس کا فضا میں غزل اُچھال گیا

کوئی خلش نہ رہی حالِ دل سُنانے کی
بس اُس کے ایک تبسّم پہ سب ملال گیا

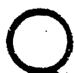
وگرنہ میں بھی بہاروں کا خواب بن جاتا
خزاں کا ایک ہی جھونکا مجھے سنبھال گیا

سفر پہ دُھوپ کے نِکلا تو روشنی نہ مِلی
کہاں کہاں نہ مرا کاسۂ خیال گیا

وہ اُس کا اِذنِ خموشی یہ میرا عزمِ سکوت
مجسّمے کی شباہت میں مجھ کو ڈھال گیا

ٹپک رہا ہے مسلسل مری انا کا لہو
مرے وجود کا پیکر کوئی کھنگال گیا

جہاں میں اب وہ کہاں ہیں صنم تراش نوید
بتوں کا شہر تو ہے، آذری کمال گیا



بپا ہے شہر میں اِک جشنِ بے حسی جیسے
مزارِ شہرِ خموشاں ہے زندگی جیسے

ضرورتاً کئی چہرے بدلتا پھرتا ہے
نئی صدی کا تماشہ ہے آدمی جیسے

گھِسے پِٹے ہوئے لفظوں کی قدر و قیمت کیا
وفا، خلوص، محبّت ہو، دل لگی جیسے

منائیں سوگ، مسلسل، کہ جشنِ سالگرہ
دراز ہو کہ بہت، عمر گھٹ گئی جیسے

جہاں جہاں ملی ٹھنڈک وہاں قیام کیا
مگر یہ راس نہ آئے گی، بے گھری جیسے

کبھی یہ ذوقِ نظر ہو سکا نہ آسودہ
ہر ایک شے میں نظر آئی اک کمی جیسے

ادب سے اپنا تعلّق ہے والہانہ نویدؔ
بسی ہوئی ہے رگ و پے میں شاعری جیسے



کہاں کا عہدِ وفا، کیسی بے وفائی ہے
ہیں پتھروں کے صنم جن سے آشنائی ہے

یہ دلبری کی ادا ہے کہ کج ادائی ہے
کبھی تو قربِ مسلسل، کبھی جدائی ہے

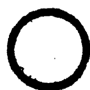
یہ اور بات کہ تنہائی ہے عزیز ہمیں
کسی سے کی ہے اگر دوستی نبھائی ہے

لگے ہیں اُن کو بھی سرخاب ہی کے پر شاید
جو اس قدر انہیں احساسِ خود نمائی ہے

یہ فرد فرد جدا ہو تو پھر اکیلا ہے
یہ فرد فرد جو مل جائے تو اکائی ہے

کسی بھی گوشۂ راحت میں سو گئی ہو گی
تھکی تھکی سی چمن میں بہار آئی ہے

ہم اپنے رنگِ تغزّل میں منفرد ہیں نوید
نہیں کلام کچھ اِس میں نہ خودستائی ہے



نہیں ہوئے ہیں ابھی پست حوصلے غم کے
گزر اے عمرِ رواں تو، مگر ذرا تھم کے

کتابِ زیست میں بکھرے پڑے ہیں برسوں سے
فسانے سادہ و رنگین ابنِ آدم کے

اندھیرے چھائیں تو کیا اور سر اُٹھائیں تو کیا
میں جانتا ہوں کہ مہمان ہیں کوئی دم کے

نہ بھر سکے، نہ بھریں گے، کبھی یہ روح کے گھاؤ
وہ اور زخم ہیں، محتاج ہیں جو مرہم کے

دیارِ یار سے نکلے تو دار تک پہنچے
ہوئے ہیں ختم، نہ ہونگے یہ سلسلے غم کے

رواں ہوئے تو انہیں آنسوؤں کا نام دیا
ٹھہر گئے تو گہر ہیں، یہ چشمِ پُرنم کے

اُٹھو کہ میکدہ بر دوش ہم کو ہونا تھا
چلو کہ حضرتِ صادق نوید آ دھمکے



یوں تصوّر میں چشمِ پُرنم ہے
جیسے پھولوں پہ عکسِ شبنم ہے

اپنے [illegible] کی بساط کیا کہیے
رُوشناسِ مزاجِ عالم ہے

تم کو دیکھا تو یوں لگا مجھ کو
زندگی جیسے ساغرِ جم ہے

جانے کیا بات آج یاد آئی!
دل فروزاں ہے درد کم کم ہے

اُن کے گیسو سُلجھ گئے لیکن
زندگی کا مزاج برہم ہے



تم جو دیتے نہ ہوا، پھر یہ لپکتا کیسے
شعلۂ عشق مِرے دل میں بھڑکتا کیسے

ہم خسارہ کے بھی آپس میں مِلا کرتے ہیں
وضع داری کا یہ انداز بدلتا کیسے

اور تو کچھ بھی نہ تھا میرے نہ آنے کا سبب
بارشِ سنگ میں یا ہر میں، نِکلتا کیسے

جسم آہن نہ سہی، دل کوئی پتھر نہ سہی
موم کی طرح شب و روز پگھلتا کیسے

وقت کے ساتھ ہے ہر شئے کا عروج اور زوال
کوئی سورج بھی اگر ہو تو، نہ ڈھلتا کیسے

سنگ دل، دل کو بھی پتّھر ہی کہا کرتے ہیں
دل بھی پتّھر اگر ہوتا تو، دھڑکتا کیسے

میں تو تھا، دامِ محبّت میں گرفتار نوید
مسئلہ کوئی بھی ہو، تم سے اُلجھتا کیسے



اِک کسک جیسے، قریبِ رگِ جاں ہوتی ہے
بے سبب کوئی غزل اپنی کہاں ہوتی ہے

کیفیت دل کی، نگاہوں سے عیاں ہوتی ہے
کچھ نہ کہنے پہ بھی رُوداد بیاں ہوتی ہے

غم سے لبریز جو ہو جاتا ہے پیمانۂ دل
ایسی حالت میں تسلّی بھی گراں ہوتی ہے

آنکھوں آنکھوں میں اشاروں کی لطافت مت پوچھ
گفتگو ہو بھی تو آواز کہاں ہوتی ہے

یہ نہ سمجھو کہ نہیں دیکھ رہا ہے کوئی
غیب کی آنکھ ہمیشہ نگراں ہوتی ہے

ہم جو کہتے ہیں، زمانے کے لبوں پر ہے وہی
بات اپنی بھی حدیثِ دِگراں ہوتی ہے

بعد مدّت کے ہُوا ہم کو یہ احساس نوید
شاعری راحتِ دل، آفتِ جاں ہوتی ہے



ہماری آنکھ کے تارو، ہمارے ساتھ رہو
غمِ حیات کے مارو، ہمارے ساتھ رہو

نگارِ صبحِ تمنّا کے مُسکرانے تک
دُکھوں کی رات گزارو، ہمارے ساتھ رہو

کرو نہ خود کو، خود اپنی نظریں بے قیمت
خُودی کو اپنی اُبھارو، ہمارے ساتھ رہو

لگے نہ ٹھیس کسی دل کے آبگینے کو
سنبھل سنبھل کے گزارو، ہمارے ساتھ رہو

رہو نہ ہم سے گریزاں، اک اجنبی کی طرح
غبار دل کا اُتارو، ہمارے ساتھ رہو

خزاں رسیدہ بہاروں کی عمر ہی کتنی
تم اپنا وقت گزارو، ہمارے ساتھ رہو

نوید اپنی جگہ آپ انجمن ہی سہی
کبھی تو آپ بھی یارو، ہمارے ساتھ رہو



عجیب آتشِ گُل کی ہے فصلِ گُلشن میں
لگے نہ آگ کہیں اپنے ہی نشیمن میں

کتابِ زیست کا عُنواں ہے زیرِ غور ابھی
قلم ہے خون میں ڈوبا تو لفظ اُلجھن میں

فسانہ ہم ہیں نئے دَور کا پڑھو ہم کو
کہانیاں تو بہت سُن چُکے ہو بچپن میں

بدل نہ پائی ابھی ذہنیت، غُلامانہ
اگرچہ طوقِ غُلامی نہیں ہے گردن میں

سکوں نواز کئی دن سے سایۂ غم ہے
دُکھوں کا پیڑ گھنا ہو گیا ہے آنگن میں

یہ آئینہ تو ہے گونگا، کلام کیا کرتا
ہمارا عکس ہی خود بولتا ہے درپن میں

ہر ایک گام یہ لازم ہے احتیاط نوید
رہے نہ فرق اگر رہنما و رہزن میں



صرف دولت ہی خدا سے نہ ہمیشہ مانگے
آدمی وہ ہے جو جینے کا سلیقہ مانگے

کون ساحل پہ لبِ خشک لیئے ٹھہرا ہے
جس کو پانی کی طلب ہے اُسے دریا مانگے

اک سمندر جو کبھی شرم سے پانی نہ ہُوا
قطرۂ آب اُسی سے کوئی پیاسا مانگے

بے حسی کی وہ کڑی دُھوپ کہ جلتے ہیں شجر
جسم مجبور کہ آپ اپنا ہی سایہ مانگے

احتیاجات کی مانگوں کا تسلسل، توبہ
سخت حیران ہے انسان کہ کیا کیا مانگے

منتشر ذہن سے لفظوں کے خیالی پیکر
اپنے اظہار کا دلکش کوئی لہجہ مانگے

خودشناسی کا یہ اعزاز بھی کیا کم ہے نوید
ہم نہ مانگیں گے وہی چیز جو دُنیا مانگے



یہ تقاضائے انا ہے تو، اُبھارا جائے
آدمی اپنے ہی اندر کا نہ مارا جائے

فکر کا بوجھ جو سر پر ہے اُتارا جائے
وقت کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا جائے

کیوں نہ اِس ڈھنگ سے دُنیا کو سنوارا جائے
کوئی ناحق، کہیں اِنسان نہ مارا جائے

آسماں لاکھ جُھکے بھی تو اُبھرتا سورج
غیر ممکن ہے کہ دھرتی پہ اُتارا جائے

وقت جو بیت گیا، بیت گیا، بیت گیا
اب نہ بیتے ہوئے لمحوں کو پکارا جائے

دوست کا ذکر ہی کیا، ہاتھ مِلائے دشمن
اپنے اخلاق کو اِس طرح سنوارا جائے

آج اِنسان کا اِنسان ہی دشمن ہے نوید
کوئی شیطاں ہو تو شیشے میں اُتارا جائے



مشکل ہے بہت کرنا، گفتار کا اندازہ
باتوں سے نہیں ہوگا کردار کا اندازہ

ممکن ہے غلط کر لے ہشیار مسیحا بھی
چہرے کے تبسّم سے بیمار کا اندازہ

فنکار کی صحبت میں اک عمر گزرنے پر
ہوتا ہے کہیں اُس کے افکار کا اندازہ

کچھ سوچ سمجھ کر ہی، کرتے ہیں نظر والے
تعمیر کی عظمت سے معمار کا اندازہ

لالچ میں زمانے کی بکتے ہیں وہی اکثر
وہ جن کو نہیں ہوتا بازار کا اندازہ

جس شخص کے سینے میں جذبات کا طوفاں ہو
آساں نہیں اُس کے افکار کا اندازہ

برحق ہے نوید اُن کو، معذور سمجھ لینا
جو کر نہیں پاتے معیار کا اندازہ



بستیوں میں خود کو تنہا دیکھ لے
ہے یہی دُنیا تو دُنیا دیکھ لے

جا کے وہ پردیس کیوں لوٹا نہیں
اور کچھ دن اُس کا رستا دیکھ لے

کیا یہی دُنیا یہی ہے زندگی
مر کے جینے کی تمنّا دیکھ لے

غیر پھر اپنے ہیں، اپنے غیر ہیں
کون کرتا ہے بھروسہ دیکھ لے

جس کو کہتے ہیں بہارِ زندگی
چار دن کا ہے تماشا دیکھ لے

حُسن کی بے باک نظریں الاماں
دل کو سینے میں دھڑکتا دیکھ لے

جی رہے ہیں ہم برائے زندگی
زندگی کا گھر اُجڑتا دیکھ لے

اک خدا کی راہ میں، صد اختلاف
جا کے مسجد اور کلیسا دیکھ لے

کون اپنا ہے پرایا کون ہے
کون ہوتا ہے کسی کا دیکھ لے

آہ بھر کے درد کا چرچا نہ کر
کوئی ہو جائے نہ رسوا دیکھ لے

کچے دھاگے کا نہیں کچھ اعتبار
پیار کا نازک ہے رشتہ دیکھ لے

ٹوٹتے ہیں جس پہ رہ رہ کے ستم
وہ ہے پتھر کا کلیجا دیکھ لے

گھپ اندھیرے میں کہاں تیرا وجود
روشنی پھیلے تو سایا دیکھ لے

منحرف ہے گر حقیقت سے نوید
کوئی خوابوں کا جزیرہ دیکھ لے



وہ جو وعدہ وفا نہیں کرتے
نام اُن کا لیا نہیں کرتے

جانتے ہیں اُلٹ کے آئے گی
اس لئے یہ دُعا نہیں کرتے

مہرباں ہم پہ کوئی ہو کہ نہ ہو
ہم کسی کا گِلہ نہیں کرتے

رہ کے وابستہ تیرے نام کے ساتھ
خود کو تجھ سے جُدا نہیں کرتے

راستے راستوں سے مِلتے ہیں
مِلنے والے رُکا نہیں کرتے

تجھ کو اپنا کے ہم ہوئے بدنام
لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

فکرِ منزل عزیز ہے جن کو
خود کو بے دست و پا نہیں کرتے

دل جو کہہ دے وہی لکھیں گے نوید
بے سبب ہم لکھا نہیں کرتے



لے گیا کشتی جو خود کھیتا ہُوا
ایک ہی تو آدمی تھا کیا ہُوا

دیدنی تھا اُس کا اندازِ سُخن
لب کھُلے تو شعر کا دھوکا ہُوا

تشنگی بڑھ کر سمندر پی گئی
ایک قطرہ تھا سو وہ، دریا ہُوا

گھر سے ہم نکلے ہی تھے، پہنچے وہ گھر
اک دفعہ کیا، بارہا ایسا ہُوا

اک خوشی مانگی تو کیا کیا غم ملے
اک خوشی سے کون آسودہ ہُوا

زندگی ایسی ہے، جیسے اِک دیا
جل رہا ہو، روشنی دیتا ہُوا

کیا کریں پرواز کی جرأت نوید
دل تو ہے سینے میں پر ٹوٹا ہُوا



اپنا جسے کہتے ہیں وہ اپنا نہیں لگتا
کہتے ہوئے یہ بات، کچھ اچھا نہیں لگتا

معلوم ہے حد اُس کی، کنواں پھر بھی کنواں ہے
وہ جوش میں اُبلے بھی تو دریا نہیں لگتا

گھر گھر پہ صدا دے کے، گھٹا لوٹ گئی ہے
شاید کہ کوئی شہر میں پیاسا نہیں لگتا

وہ شخص جو برسوں سے غمِ ذات میں گم ہے
تنہا نظر آئے بھی تو، تنہا نہیں لگتا

بات آئے قرینے کی تو، ہر بات کرشمہ
شکوا ہو سلیقے سے تو شکوا نہیں لگتا

صورت ہے کچھ ایسی کہ بدلنا نہیں آساں
چہرے پہ لگائیں بھی تو چہرا نہیں لگتا

وہ لوگ کہاں ہیں جو کہا کرتے تھے اکثر
انسان کو انسان سے خطرا نہیں لگتا

تنہائی کے صحرا میں شجر ہے نہ حجر ہے
خونخوار درندوں کا بھی کھٹکا نہیں لگتا

دیکھے تو کوئی فطرتِ انساں سے زیادہ
دلچسپ کوئی اور تماشا نہیں لگتا

سچ کہہ کے نوید آپ ہوئے حرفِ ملامت
کہتے جو اگر جھوٹ تو کڑوا نہیں لگتا



ویسے بھی پہلے، کم تو نہ تھی اپنے گھر کی دھوپ
کچھ اور دے گئی ہے ہوا، رہگذر کی دھوپ

کیا جانے کیا دکھائیں گی منظر، یہ گرمیاں
ڈسنے لگی ہے ذہن کو خوف و خطر کی دھوپ

یہ اور بات ہے کہ تبسم میں ٹال دیں
لائی ہوئی ہے یہ بھی اُسی چارہ گر کی دھوپ

بہتر ہے گھر میں بیٹھ رہیں، عافیت کے ساتھ
لوٹتے ہے، مُضر ہے بہت دربدر کی دھوپ

خوش باش زندگی کے مسافر، ٹھہر کے چل
تجھ کو بھی کھا نہ جائے کہیں اب سفر کی دھوپ

سایہ خدا کا سر پہ رہے تو جہاں رہے
حصّے میں میرے آئے، تری عمر بھر کی دھوپ

ڈھلتے ہیں لفظ شعر کے پیکر میں اب نوید
موسم کی طرح تیز ہے فکر و نظر کی دھوپ



کچھ جھوٹ سچ، نہ ہو تو فسانہ کسے کہیں
بدلے نہ ہر گھڑی تو زمانہ کسے کہیں

وعدہ کی طرح عُذر بھی کرتے ہیں بار بار
ہر عُذر ہے بجا تو بہانہ کسے کہیں

روئے سُخن کسی کی طرف ہے نظر کہیں
ہے کون اُن کی زد میں نشانہ کسے کہیں

عاشق ہیں اور دعوئے فرزانگی بھی ہے
یہ حال اُن کا ہے تو دِوانہ کسے کہیں

یہ سچ ہے مُنہ پہ مصلحتِ وقت کا ہے ہاتھ
کتنا بدل گیا ہے زمانہ کسے کہیں

سانسوں کے کاروبار کا ہے نام زندگی
ہر وقت ہیں سفر میں ٹھکانہ کسے کہیں

جب بھی کہیں جدید کہیں گے غزل نوید
جدّت نہ ہو تو فکرِ یگانہ کسے کہیں



راہ کا جب ادراک نہیں تھا جو بھی چلا ہم ساتھ چلے
بات پہ جب یہ بات جو نکلی ماضی کی کچھ بات چلے

ہم بھی سفر میں، تم بھی سفر میں، برسوں سے جاری ہے سفر
کوئی نہ منزل تک جا پہنچا، چلنے کو دن رات چلے

شام و سحر ہم گردش میں ہیں، گردش میں ہیں شام و سحر
درد کے ماروں کی دنیا میں درد کی یہ سوغات چلے

سب ہیں اُن کے چاہنے والے، چاہنے والے سب اُنکے
پیچھے پیچھے یوں چلتے ہیں جیسے کوئی بارات چلے

سچ کے سکّے کی دُنیا میں کون کرے گا قدر نوید
بستی بستی جھُوٹ کا کھوٹا سکّہ ہاتھوں ہاتھ چلے



تجھ کو لکھتے رہیں اپنا کہ پرایا لکھیں
کوئی پوچھے ترے بارے میں تو ہم کیا لکھیں

یہ حقیقت ہے، زمانے کی خطرناک ہے دھوپ
دھوپ میں تپتے رہیں اور اسے سایا لکھیں

زندگی کے کوئی آثار نہیں ہم میں تو کیا
وضع داری کا تقاضہ ہے کہ زندا لکھیں

عقل کا دل سے یہی مشورۂ باہم ہے
حال محبوب کا لکھیں کہ سراپا لکھیں

دل کی دنیا میں تب و روز اندھیرا ہے مگر
دیکھ کر جلتے ہوئے گھر کو اُجالا لکھیں

رسم یہ عام ہے اب اہلِ چمن میں یارو
خار کو پھول کہیں اور شگفتا لکھیں

لکھنے والوں سے یہی کہتا ہے نقاد نوید
زندگی سے ہے جو حالات کا رشتا لکھیں



پہلے تو عقل و ہوش کا عالم خریدیئے
پھر زندگی کے واسطے کچھ غم خریدیئے

بہتے ہے انجذاب کا اِک سلسلہ رہے
دامن ملے تو دیدۂ پُرنم خریدیئے

بازار میں بکاؤ کہاں ہے ہر ایک شئے
حرص و ہوس کو چھوڑ کے، دَم خَم خریدیئے

اسباب سے سفر کا مزہ کرکرا نہ ہو
جو بھی خریدنا ہو، بہت کم خریدیئے

دولت کی آرزو ہے تو پھر دُور جائیے
خوشیوں کی جستجو میں کبھی غم خریدیئے

اُس کے بغیر جیسے سزا ہو گئی حیات
ملتی کہاں ہے اُلفتِ باہم خریدیئے

گر چاہیئے مقام کوئی منفرد، نوید
اک دلنواز لہجۂ شبنم خریدیئے



اُن کی آنکھوں میں تو تھا، اقرار سا
ہے مگر طرزِ عمل، انکار سا

ظاہری حالات پر ہرگز نہ جا
سب نظر آئیں گے تجھ کو، یار سا

ہائے کس دل سے کہیں ہم اِس کو دل
ہو گیا ہے یہ بھی کچھ بیمار سا

اک تبسّم پر ہوئے کیا کیا گماں
اک تبسّم تھا، لبِ اظہار سا

زندگی کی چاہ میں مرتے ہیں ہم
زندگی سے ہے عجب اِک، پیار سا

کوئی ناداں ہو تو کہتا ہے یہی
شاعری ہے مشغلہ بیکار سا

دھڑکنوں کا شعر میں ڈھلنا نوید
مرحلہ ہے اک بڑا دُشوار سا



کوئی اُلجھن ہو ، مشورا کیجیے
دل جو کہہ دے ، وُہی کیا کیجیے

جس نے پیدا کیا ہے دُنیا کو
نام سے اُس کے ابتدا کیجیے

دیکھئے ہم کہاں پہنچتے ہیں
کوئی موقع ہمیں عطا کیجیے

عمر کٹتی رہے گی قسطوں میں
زندگی قرض ہے ، ادا کیجیے

موت اپنی مرے گا خود ظالم
کیا ضروری ہے بد دعا دیجے

ہم تمہارے لیئے کریں گے دعا
تم ہمارے لیئے دعا دیجے

وہ بھی آئیں گے راہ پر اک دن
درمیاں دل کے راستا دیجے

دل میں جب کوئی بولتا ہو نوید
شعر کہنا پڑے، کہا کیجے



غم مجھ کو دے ضرور، غمِ لا دوا نہ دے
اے دینے والے جو بھی دے خدا سے بِوا نہ دے

جنگل کی آگ جیسی ہے نفرت کی آگ بھی
اب تو خُدا کے واسطے اس کو ہوا نہ دے

کیا ہوگا دل کی بات بتانے سے فائدہ
وہ سُن کے میرا حال کہیں مُسکرا نہ دے

ہمدردیوں کی کِس کو ضرورت نہیں، مگر
بے آسرا سمجھ کے مجھے آسرا نہ دے

ہر بات اِحتیاط سے کرتا ہوں، اس لیئے
کیا جانے کوئی بات، ترا دل دُکھا نہ دے

اس طرح میرے دل کی تسلّی کے واسطے
ہر بات پر خدا کا بھی واسطا نہ دے

کیونکر نہ اُس کو، راہ کا پتھر کہیں نوید
جو راستے پہ آئے تو، پھر راستا نہ دے



عمر بھر تشنگی، نہیں ہوتی
کاش آنکھوں سے پی نہیں ہوتی

تم سے مِلنا خوشی کی بات، مگر
تم سے مِل کر خوشی نہیں ہوتی

پاس اپنے وہ جب نہیں ہوتے
دن میں بھی روشنی نہیں ہوتی

غم کو ہنس کر گلے لگانے تک
زندگی، زندگی، نہیں ہوتی

سامنے جب نہ ہو وہی صورت
کوئی دل بستگی، نہیں ہوتی

دُور سے راستہ دِکھاتے ہو
اِس طرح رہبری نہیں ہوتی

دل پہ جب تک نہ چوٹ کھائیں نوید
شاعری، شاعری نہیں ہوتی



جس شخص کو حالات نے روکا بھی بہت تھا
اُس شخص کو چلنے کا سلیقا بھی بہت تھا

محفل میں جو روتے ہوئے لوگوں کو ہنسایا
تنہائی میں آپ اپنے پہ روتا بھی بہت تھا

وہ لوٹ کے شائد کبھی آئے کہ نہ آئے
جاتے ہوئے اُس نے مجھے دیکھا بھی بہت تھا

معلوم نہیں، ترکِ تعلق سے مِلا کیا
حالانکہ محبّت کا یہ رِشتا بھی بہت تھا

سُنتے ہیں کہ اُس شخص پہ ہنستا ہے زمانہ
جو حال مِرا دیکھ کے ہنستا بھی بہت تھا

بادل جو گرجتا ہے، برستا نہیں، لیکن
گرجا بھی بہت اور وہ برسا بھی بہت تھا

ہے لُطف نوید آپ کے انداز میں پنہاں
بس آپ کا لکھّا ہُوا، تھوڑا بھی بہت تھا

صادق نوید

(مسلسل غزل)



جبیں میری ہے اُس کا نقشِ پا ہے
ابھی تو عشق کی یہ ابتدا ہے

یہ افسانہ نہیں ہے واقعہ ہے
ہماری زندگی، جلتا دیا ہے

ہُوا کرتی ہے دِل سے راہ دل کو
چلے آؤ یہ سیدھا راستا ہے

ترنّم لُٹ گیا ہے زندگی کا
غزل کے روپ میں اب مرثیا ہے

کسی نے نام تک اُس کا نہ پُوچھا
جو گھر آ کر دلاسہ دے گیا ہے

سوال اُس سے نہ کیجے امتحاناً
ابھی بچہ ہے، کم کم بولتا ہے

نہیں کچھ خوف ہم کو حادثوں کا
ہماری زندگی خود حادثا ہے

جسے دیکھو، ہے اپنی ذات میں گم
یہ اپنے دور کا اک المیہ ہے

ہم اپنا خون پی کر جی رہے ہیں
یہ جینا ہے کہ جینے کی سزا ہے

پرائی آگ میں جلتا ہے اپنا
یہی تو شیوۂ اہلِ وفا ہے

بہت مشکل ہے اب بچ کر نکلنا
خود اپنی ہی انا کا سامنا ہے

لڑکپن سے ہم عاشق ہیں غزل کے
غزل جانِ سخن ہے، دلربا ہے

نئی تکنیک سے اب جینا پڑے گا
نظامِ زندگی بدلا ہوا ہے

نوید اپنا تخلص، نام صادق
ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے



زندگی کیا ہے، کبھی سوچا تو کچھ سمجھا نہیں
اس کے بارے میں زیادہ سوچنا اچھا نہیں

دیدنی ہے اب، تماشائے بہارِ گلستاں
اک کلی چٹکی نہیں، اک پھول تک مہکا نہیں

غم کے صحرا میں بھٹکتے پھر رہے ہیں رات دن
گھر کو واپس لوٹنے کا راستا ملتا نہیں

سچ پہ اکثر جھوٹ کا لوگوں کو ہوتا ہے گماں
اب زمانے کی نگاہوں میں کوئی سچا نہیں

آج کے بچوں میں بچپن کا وہ بھولاپن کہاں
سب کے سب بالغ ہی لگتے ہیں کوئی بچہ نہیں

جانے کیونکر ہو گئے وہ جان کر انجان سے
ہم کو وہ بالکل نہیں پہچانتے ایسا نہیں

یوں تو دنیا میں بہت ہیں نامور شاعر نوید
میرؔ و غالبؔ کی طرح کوئی غزل کہتا نہیں



زمانے تجھ پہ بھی آئے گا اعتبار مجھے
جو ہو سکے تو نئے ڈھنگ سے سنوار مجھے

جنم جنم کے سفر میں یہ بے رخی کیسی!
میں وقت ہوں تو مرے ساتھ آ، گزار مجھے

ذرا سی لغزشِ پا پر نہ مسکرا ہمدم
تو میرا دوست اگر ہے، تو پھر سہار مجھے

خود اپنے آپ سے ملنے کی آرزو ہے بہت
ملے گا اور کہاں ایسا غمگسار مجھے

سراپا عجز ہوں، لیکن انا کے خول میں ہوں
سکوں نواز بہت ہے یہی حصار مجھے

فرشتے رشک کریں جس پہ میں وہ انساں ہوں
ملا ہے روزِ ازل سے یہ افتخار مجھے

دلوں میں جب بھی اترتی ہے میری بات نوید
سخن شناس سمجھتے ہیں، تاجدار مجھے



یہ کیسا جبر ہے، کیا امتحاں ہے
زمیں سر پر بشکلِ آسماں ہے

اُٹھاتا ہے جو اُنگلی، دوسروں پر
اُسے پہچان خود اپنی کہاں ہے

ہے مسلک کاروبارِ عشق اپنا
نہیں معلوم کیا سود و زیاں ہے

محبّت ہی تو مذہب ہے ہمارا
محبّت ہی حیاتِ جاوداں ہے

عداوت ہم نہیں رکھتے کسی سے
خدا جانے وہ کیوں کر بدگماں ہے

بہت مشکل ہے یہ آسان رستہ
مسافت، دو دلوں کے درمیاں ہے

چلے آؤ کہ سنّاٹا ہے دل میں
بھری بستی میں اِک خالی مکاں ہے



برسوں سے میں تلاش میں، جس کی لگن میں تھا
وہ شخص میری روح میں، میرے بدن میں تھا

خود سے بھی ہو سکی نہ کبھی کھل کے گفتگو
ہر لمحہ دل کسی نہ کسی انجمن میں تھا

کچھ لوگ دور جا کے، وطن سے ہوئے قریب
اک بے وطن کی طرح میں اپنے وطن میں تھا

گلشن میں یوں تو اور بھی منظر تھے دلفریب
کیا جانے کیا غرور گلوں کی پھبن میں تھا

یہ اور بات ہے کہ زمانہ بدل گیا
سکّہ تمہارے نام کا پھر بھی چلن میں تھا

اک خار سا کھٹکتا رہا، دل کے آس پاس
تخلیق کا یہ کرب اسی اک چبھن میں تھا

میں ساتھیوں کو دوست ہی کہتا رہا نوید
مخلص میں سب کو جان کے دیوانے پن میں تھا



حسن مائل بہ کشش ہو تو، غزل ہوتی ہے
عشق کی دل میں تپش ہو تو، غزل ہوتی ہے

سوزِ پنہاں نہ سہی، حرفِ تمنّا نہ سہی
کوئی بے نام خلش ہو تو، غزل ہوتی ہے

سامنے جانِ غزل، رشکِ غزل ہو بھی تو کیا
اُس کی آنکھوں میں کشش ہو تو غزل ہوتی ہے

محفلِ شعر میں ناگفتہ سخن سے پہلے
گرمیِ داد و دہش ہو تو، غزل ہوتی ہے

کیا ضروری ہے کہ ہو، ذہن روایت کا اسیر
طبعِ آزاد منش ہو تو، غزل ہوتی ہے

جادۂ عام سے، بچتے ہوئے چلنا ہے نوید
اک الگ، اپنی روش ہو تو، غزل ہوتی ہے



شعور و فکر کی کتنی کمی ہے
خود اپنے آپ سے بھی دشمنی ہے

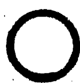
تجاہل آپ کا ہے، عارفانہ
نظر دانستہ، غیروں پر جمی ہے

خود اپنے ہی لئے ہم جی رہے ہیں
ہماری زندگی، کیا زندگی ہے

ہوئے رخصت، صفاتِ آدمیت
بظاہر دیکھنے میں، آدمی ہے

قلم سے جیت لے، اقلیم دل کو
یہی سب سے بڑی قلم آوری ہے

نوید اب کیا کہیں، تصدیق کر لو
ملی ورثے میں، مجھ کو شاعری ہے



وہ سورج سر پہ آیا بھی نہیں ہے
پسِ دیوار سایا بھی نہیں ہے

نگاہوں میں ہیں، سب مٹّی کے پُتلے
کسی کو بُت بنایا بھی نہیں ہے

کہاں ہم اُس کو ڈھونڈیں، کس سے پوچھیں
پتہ اُس نے بتایا بھی نہیں ہے

نہیں توڑا کسی کے دل کا مندر
خدا کے گھر کو ڈھایا بھی نہیں ہے

سُنا ہے، اپنے دل سے، اُس نے ہم کو
بھُلایا ہے، بھُلایا بھی نہیں ہے

ہمارا دل ہے اِک جلتا ہوا گھر
ہم نے بجھُایا بھی نہیں ہے

نویدؔ آنکھوں میں گویا عکس اُس کا
سمایا ہے، سمایا بھی نہیں ہے



تو بھی بدظن ہو مرے یار، تو پھر کیا ہوگا
بیچ میں اُٹھ گئی دیوار تو پھر کیا ہوگا

ہم تو بکتے ہیں محبّت میں محبّت کے عوض
کوئی ہوگا نہ خریدار تو پھر کیا ہوگا

مال و زر چیز ہے کیا، اس کا زیاں کچھ بھی نہیں
لُٹ گئی دولتِ کردار، تو پھر کیا ہوگا

دشمنوں سے تو خبردار رہیں گے، لیکن
دوست ہوں درپئے آزار تو پھر کیا ہوگا

راز کی بات اگر ہے تو چھپائے رکھنا
کوئی سُن لے پسِ دیوار تو پھر کیا ہوگا

ہم بھری بزم میں حق بات تو کہہ دیں گے مگر
کوئی ہوگا نہ طرفدار، تو پھر کیا ہوگا

باہمی ربط بھی آپس میں ضروری ہے تو پھر
ہو کسی سے نہ سروکار، تو پھر کیا ہوگا



فلک سے ہے ہمارا واسطا کیا
زمیں پر بھی قدم اپنا جما کیا

کہانی اک نئی، چھیڑو کہیں سے
اب اس کی ابتداء کیا، انتہا کیا

میں چھیڑوں گر کوئی اُلفت کا نغمہ
بدل جائے گی یہ ساری فضا کیا

زرا خود کو بھی آئینے میں دیکھو
دکھاؤ گے ہمیں کو، آئینہ کیا

شکایت کیا کریں گے ہم کسی سے
یہ سب اپنے ہیں، اپنوں سے گِلا کیا

غزل کے روپ میں رُوداد دل کی
سُنانے سے مِلا ہے یار ہا، کیا

نویدؔ، ائے کاش، کوئی اتنا سمجھے
خودی کا فلسفہ کیا ہے، اَنا کیا



آدمی اک عجیب ڈھب کا تھا
سب سے رہ کر جُدا، وہ سب کا تھا

رات لوٹی نہ کوئی دن لوٹا
سلسلہ یوں تو روز و شب کا تھا

شاعری شاعری سہی، پھر بھی
فرق گویا عجم، عرب کا تھا

مہکی مہکی ہوئی فضاؤں میں
لمس پنہاں، کسی کے لب کا تھا

آدمی، آدمی تھے سب، لیکن
فرق ان میں، حسب نسب کا تھا

غیر کے در پہ، کیا جھکاتا سر
کیونکہ بندہ میں اپنے رب کا تھا

ہم ملے بھی تو، دل ملے نہ کبھی
فاصلہ درمیاں، غضب کا تھا

شعر کہتے رہے، سدید، نوید
ہم سے رشتہ نئے ادب کا تھا



امن دنیا میں، اسے خدا کر دے
ختم فتنوں کا سلسلہ کر دے

کوئی لڑنے نہ پائے آپس میں
قوم کو، درد آشنا کر دے

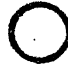
کھول دے، سب دلوں کے دروازے
درمیاں اِن کے راستا کر دے

وہ جو ناحق ہیں، بدگماں مجھ سے
اب مرا، اُن کا سامنا کر دے

زندگی اک عذاب جیسی ہے
زندہ رہنے کی بد دعا کر دے

ہم وفاؤں کی خو، نہ چھوڑیں گے
تو جفاؤں کی انتہا کر دے

ذہن میں جو خیال آئے نوید
میرا لہجہ اُسے، نیا کر دے



فضا میں زہر ہے، موسم خراب ہے اب کے
نفس نفس میں بڑا اضطراب ہے اب کے

یہ شہر شہر فسادوں کا سلسلہ کیسا
مزاجِ وقت، مسلسل خراب ہے اب کے

سکون کے دن ہیں، نہ راتیں ہیں چین کی راتیں
یہ کیسا قہر ہے، کیسا عذاب ہے اب کے

پگھل رہے ہیں بدن اور جل رہے ہیں دماغ
سروں پہ ٹھہرا ہوا، آفتاب ہے اب کے

وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں عجیب نظروں سے
نظر نظر میں بڑا پیچ و تاب ہے اب کے

نہ آپ آئے نہ کوئی پیام ہی آیا
مرے حضور یہ کیسا عتاب ہے اب کے

چمن کو کس کی نظر لگ گئی خدا جانے
شگفتہ پھول نہ کوئی گلاب ہے اب کے

اُسی کو پی کے بہکنے لگے ہیں رند نوید
جو بوتلوں میں پرانی شراب ہے اب کے



ماضی کی شاعری میں شرابِ کُہن کا رنگ
لہجہ جُدا، الگ ہے ہمارے سخن کا رنگ

صحرائے دل میں سایۂ گیسو، نہ اک شجر
سنولا گیا ہے دھوپ میں کتنا بدن کا رنگ

بیساکھیوں کے زور پہ اِٹھلا کے یوں نہ چل
کچاّ ہے تِتلیوں سا، ترے بانکپن کا رنگ

آلودگی سے تاج محل کو بچایئے
شانِ ہے اس کے رنگ میں گنگ وجمن کا رنگ

ہندوستاں کی شان ہے، تہذیبِ مُشترک
رنگوں کا امتزاج ہے، اپنے وطن کا رنگ

خود کو بھی خوشنما وہ سمجھنے لگے پرند
کس کو پسند آئے گا، زاغ و زغن کا رنگ

احساس کو مِلا ہے، نیا پیرہن نوید
ظاہر ہے شاعری سے، مری فکر و فن کا رنگ



سامنے آنکھوں کے، ہر منظر ہے کجلایا ہوا
یا کہ بینائی میں اپنی، فرق [illegible] آیا ہوا

متصّل مسجد کے ہوں اک گھر بنا کر مطمئن
شکر ہے میرے خدا، میں تیرا ہمسایہ ہوا

غم کے بادل ہی نظر آتے ہیں تا حدِّ نظر
میری آہوں کا دھوا[illegible] ہے ہر طرف چھایا ہوا

سر اٹھا کر چل رہا ہے، آسماں پر ہے دماغ
کیوں مصاحب کی طرح پھرتا ہے اِترایا ہوا

خالقِ نغمہ ہیں ہم، ہم سے نیا نغمہ سنو
گیت کیونکر گائیں اوروں کی طرح، گایا ہوا

بستیوں میں بھی درندوں کی طرح رہتے ہیں لوگ
آدمی گویا، ترقی کر کے، چوپایا ہوا

تیرے غم سے دل بہت مانوس ہے اے زندگی
غم کا کوئی غم نہیں، ہر غم ہے اپنایا ہوا

زندہ رہنے کی سزا دیتی ہے یہ دنیا نوید
میں یہاں از خود نہیں آیا، ہوں میں لایا ہوا



سارے تہذیبی رشتے ہموار ہوئے
جب بھی کوئی عید آئی، تیوہار ہوئے

پیار کا پرچم لہرایا، جب لوگوں نے
پھوٹ کے سارے منصوبے بیکار ہوئے

اپنے وطن پہ حملہ آور جو بھی ہوا
اُس کے آگے سینے کی دیوار ہوئے

یاروں نے دانستہ عداوت کی ہم سے
اور جو کٹّر دشمن تھے، وہ یار ہوئے

آپس میں ہم دست و گریباں ہو ہو کر
دُنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوئے

مذہب کو یاروں نے سیاسی رنگ دیا
شعلے بھڑکے خاکستر بازار ہوئے

دہشت گردی خون خرابہ، کھیل بنا
لاشیں بکھریں، گھر اُجڑے مسمار ہوئے

ہم بھی ایسے شاعر ہیں، حساس نوید
جب جب دل کو ٹھیس لگی، اشعار ہوئے



یہ کیسی رنجشِ باہم، اُسی کے گھر پر ہے
وجود جس کا، ہمارے دِلوں کے اندر ہے

تماشہ کرتا پھرے ہے جو خود نمائی کا
اُسے پتہ ہے کہ وہ دوسروں سے کمتر ہے

وہ تحفتاً جو کبھی پھول لے کے آیا تھا
اُسی کے ہاتھ میں پوشیدہ آج پتھر ہے

اُسے گِرا کہ بصد شوق آ، گلے لگ جا
میں جانتا ہوں تری آستیں میں خنجر ہے

سوائے لفظِ محبّت کے، کچھ بھی یاد نہیں
یہی اک ایسا سبق ہے، جو مجھ کو ازبر ہے

چلا رہا ہے وہ دُنیا کو اپنی مرضی سے
اُسی کو بھول گئے ہو، جو سب سے برتر ہے

شعور و فکر کی ہر فصل ہے، جدید، نوید
زمینِ شعر بھی زرخیز ہے، تو بنجر ہے



کچھ نہ کچھ کیجیے، زندگی کے لئے
زندگی چاہیئے آدمی کے لئے

چھا نہ جائیں کہیں، ذہن پر ظلمتیں
دل جلاؤ، نئی روشنی کے لئے

عام کرنا محبت کے پیغام کو
اب ضروری ہے، ہر آدمی کے لئے

تیرگی میں چمکتا رہے رات بھر
ایک ننھا دیا، روشنی کے لئے

دل لگانا نہیں ہے کوئی مشغلہ
دل لگاتے نہیں، دل لگی کے لئے

ہم ہیں اہلِ وطن، فخرِ ارضِ دکن
ہم تو مشہور ہیں، دوستی کے لئے

کوئی ہمدم، نوید اب نہیں ہے تو کیا
طبعِ موزوں تو ہے شاعری کے لئے

(غزلِ مُسلسل)



گھر سے ہم نِکلے تو سَر پر آسماں اچھّا لگا
چلتے چلتے راہ میں شہرِ بُتاں اچھّا لگا

پُرسشِ احوال سے کچھ اور گھبراتا ہے دِل
مہرباں سے جانے کیوں، نامہرباں اچھا لگا

اتفاقاً جاتے جاتے چند لمحوں کے لئے
بیٹھنا اُس کا، ہمارے درمیاں اچھا لگا

کوئی در ہے نہ کچھ ہنگامۂ عیش و نشاط
مدّتوں کے بعد اک خالی مکاں اچھا لگا

رونقِ گُلشن، ہزاروں آشیانے تھے، مگر
بجلیوں کو صرف اپنا آشیاں اچھا لگا

ہیں تعاقب میں مُسلسل موت کی پرچھائیاں
پھر بھی ہم کو زندگی کا کارواں اچھا لگا

ہر جگہ محسوس کی ہم نے رفاقت کی مہک
تیرے ہر دم ساتھ ہونے کا گماں اچھا لگا

چاہ میں تسکین کی صورت رہی کچھ اس طرح
جس میں یوسف تھے، وہی اندھا کنواں اچھا لگا

اس سے بڑھ کر اور کیا خونِ تمنّا دیکھتے
اُن کو اپنے دل کی آہوں کا دھواں اچھا لگا

یوں تو دنیا میں کئی اچھے سخنور ہیں نوید
درحقیقت آپ کا طرزِ بیاں اچھا لگا



کچھ بے بس و مجبور نہیں اہلِ قلم بھی
رکھتے ہیں زمانے میں محبت کا بھرم بھی

کندھوں پہ غمِ ذات کا اک بوجھ اُٹھائے
ہم جھیلتے رہتے ہیں زمانے کے ستم بھی

اِک پل بھی اکیلا مجھے رہنے نہیں دیتا
سائے کی طرح ساتھ ہے تنہائی کا غم بھی

ہم ماہیٔ بے آب ہوئے تجھ سے بچھڑ کر
یاد آئے ستم اور ترے لطف و کرم بھی

اشکوں کو تبسم میں چھپانا نہیں آساں
ڈر ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے دیدۂ نم بھی

ہر شخص تو اخلاص کا پیکر نہیں ہوتا
کہنے کو مرے دوست زیادہ بھی ہیں کم بھی

یہ کیا کہ نوید آپ ہیں خود اپنے مقابل
سہنا ہی پڑا، اپنی انا کا یہ ستم بھی



ہم کو کیا مطلب نمود و نام سے
آدمی کا قد ہے اونچا کام سے

اُس کے فقروں میں تھی کانٹے کی چُبھن
لفظ تھے، لیکن لگے دُشنام سے

ڈوب جاتا ہے یہ سورج کی طرح
دِل بُجھا رہتا ہے اکثر شام سے

مسجد و مندر ہیں دونوں محترم
بَیر کیا رکھیں رحیم و رام سے

مشترک تہذیب کے حامی جو تھے
عُمر اُن کی کٹ گئی آرام سے

دار پر بھی ہو گی، حق کی گفتگو
جذبۂ صادق ہے ظاہر نام سے

لفظ و معنیٰ میں تعلّق ہے نوید
بچ کے ہم رہتے ہیں اِبہام سے



یادوں کا دل میں ایک جزیرا لیئے ہوئے
پھرتا ہوں اپنے آپ میں کیا کیا لیئے ہوئے

سائل کی طرح کاسہ بکف ہوں کھڑا ہوا
میں زخم زخم، حرفِ تمنّا لیئے ہوئے

تیرہ شبی ہے اور کوئی ہمسفر نہیں
چلتا ہوں جگنوؤں کا اُجالا لیئے ہوئے

رہتا ہوں سب سے مِل کے طرحدار کی طرح
اپنی اَنا کا بوجھ اکیلا، لیئے ہوئے

سب کچھ ہے میری ذات میں، لیکن بذاتِ خود
پیاسا ہوں میں، وجود کا دریا لیئے ہوئے

مِلنے کا اپنے آپ سے، میں بھی ہوں منتظر
خود آگہی کا عزم و اِرادہ لیئے ہوئے

وابستۂ حیات ہوں، اس طرح میں نوید
دُنیا سے دُور دُور ہوں، دنیا لیئے ہوئے



درد دیتا ہے کوئی اب نہ دوا دیتا ہے
ایسے لگتا ہے کہ جینے کی سزا دیتا ہے

پھل کے عنوان سے پودا جو لگا دیتا ہے
پیڑ بن جائے تو سایہ بھی گھنا دیتا ہے

دل پہ جو گھاؤ بھی لگتے ہیں، ہرے رہتے ہیں
جسم کے زخم کو ہر شخص بھلا دیتا ہے

یہ الگ بات کہ شاکی ہیں ہوس کے بندے
دینے والا تو بہرحال سوا دیتا ہے

کوئی ہوگا نہ ہوا ایسا پیمبر پیدا
گالیاں سن کے جو اُمت کو دعا دیتا ہے

فکر کی شمع فروزاں ہے کھلے ذہن کے ساتھ
وقت اظہار کا لہجہ بھی نیا دیتا ہے

دست محنت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہے نوید
سخت پتھر کو بھی آئینہ بنا دیتا ہے

(یادِ اریب کے موقع پر)



ادب سے جس کا رہا بے پناہ یارانہ
وہ زندگی سے اُلجھتا رہا حریفانہ

رہا جو ہاتھ میں تاعمر اُس کے دستِ صبا
چھپا کلام کسی کا کسی کا افسانہ

وہ صبا میں شعر و ادب پہ ہوئی ہیں تنقیدیں
تھی شمعِ علم کی روشن، وہ اُس کا پروانہ

بس ایک تلخیٔ ایام بھولنے کے لیئے
تمام عمر رہا، اُس کا شغل رندانہ

وہ سرپرست، نئے شاعروں ادیبوں کا
خلوص اُس کا مسلّم، نظر کریمانہ

نہیں ہیں آج یہاں، شاذؔ، وجدؔ اور مخدومؔ
اُداس اُداس سا ہے شاعری کا کاشانہ

نویدؔ اہلِ چمن کے لبوں پہ ذکرِ اریبؔ
صبا کی آنکھ میں ہے آنسوؤں کا نذرانہ



آدمی وضعدار تھے، کم تھے
باعثِ افتخار تھے، کم تھے

پھول ہی پھول تھے گلستاں میں
اُن کے پہلو میں خار تھے کم تھے

تاج سر پر، نہ یادگار، محل
ایسے بھی تاجدار تھے، کم تھے

تم نے یکسر بھلا دیئے کیسے
وہ جو قول و قرار تھے، کم تھے

اَن گنت سر، نہ آئے گنتی میں
آدمی بے شمار تھے، کم تھے

سب کو دعویٰ تھا جانثاری کا
جو رواں سوئے دار تھے، کم تھے

دِل سے ہوتی ہے دل کو راہ نوید
فاصلے گو ہزار تھے، کم تھے



شاعر ہے وہ تجھ میں جو نہاں، بول رہا ہے
آئینہ، صداقت کی زباں، بول رہا ہے

پڑھتا ہے زمانہ تجھے اخبار سمجھ کر
تو چپ ہے مگر سارا جہاں بول رہا ہے

کیا خاک سمجھ پائے گا پروردۂ عشرت
تو درد کے ماروں کی زباں بول رہا ہے

پتھراؤ پہ اٹھتی ہیں "چھنا چھن" کی صدائیں
شاید کوئی شیشے کا مکاں بول رہا ہے

محفوظ نہ رہ پاؤ گے گھر کوئی جلا کے
خاموش ہیں سب اور دھواں بول رہا ہے

مطلوب ہے ہم کو تو فقط رائے تمہاری
ہم سے نہ یہ کہنا کہ فلاں بول رہا ہے

گویا ہے نوید آپ سے پتھر کے صنم بھی
حیرت ہے کہ اب شہرِ بتاں بول رہا ہے



میں سورج کی طرح تپتا رہا ہوں
پسِ دیوار اک سایا رہا ہوں

تعارف مختصر سا ہے یہ میرا
ازل سے پیار کا رشتہ رہا ہوں

زمانہ مجھ سے، مجھ میں ہے زمانہ
مگر خود سے میں بیگانہ رہا ہوں

مری مٹھی میں ہیں، امروز و فردا
میں بچے کی طرح سوتا رہا ہوں

پرندے آسماں پر اڑ رہے ہیں
زمیں پر میں پیادہ پا رہا ہوں

گزاری عُمر ساری، شاعرانہ
کبھی گیت اور کبھی نغمہ رہا ہوں

[illegible] تشنہ لبی راس آ گئی ہے
سمندر پی کے بھی پیاسا رہا ہوں

کبھی دیکھا کیا، جانِ غزل کو
کبھی اُس پر غزل کہتا رہا ہوں

مِری ہر سانس میں خوشبو ہے تیری
تجھے اے زندگی، اپنا رہا ہوں

نویدؔ اب اپنے بارے میں کہوں کیا
دِلوں کے درمیاں رستا رہا ہوں



سُورج کبھی اِدھر بھی نِکل، میرے ساتھ آ
مِلنے اندھیری رات سے تُو، ایک رات آ

یہ عرصۂ حیات بظاہر طویل ہے
دو روزہ زندگی کو نہیں ہے ثبات آ

دُوری سے بڑھ نہ جائیں کہیں بدگمانیاں
تُو مان لے خدا کے لئے میری بات آ

سب کچھ ہے تجھ میں، تُو جو نہیں ہے تو کچھ نہیں
تجھ میں سِمٹ گئی ہے مری کائنات آ

ہر گام پر خلوص کی خوشبو بکھیر دے
کچھ ایسے اہتمام سے اے گُل صِفات آ

جو وقت ٹل رہا ہے غنیمت سمجھ اسے
ورنہ تری تلاش میں ہیں حادثات آ

تجھ پر کہیں جو شعر سُنائیں کِسے نوید
پردے میں ہم غزل کے کریں تجھ سے بات آ



وہ ایک لمحہ زندگی کا ، زندگی پہ چھا گیا
شعورِ وقت جاگ اُٹھا تو انقلاب آگیا

سفر کا لُطف ہمخیال ہمسفر کے ساتھ ہے
بچھڑ گیا جو ہمسفر، سفر کا سب مزا گیا

جواب کوئی بن پڑا نہ جب مرے سوال کا
نظر جُھکا کے رہ گئے اُنہیں حجاب آگیا

زمانہ وقت ہے تو پھر سزائے وقت کیا کہیں
سنبھل نہ پائے آج تک کچھ اس طرح نچا گیا

کبھی نہ ہٹ سکے قدم، صراطِ مستقیم سے
ہر ایک گام پر زمانہ ہم کو آزما گیا

وہ مہربان اس قدر نہ بدگمان تھا کبھی
مرے خلاف جانے کون اُس کو ورغلا گیا

کبھی تو ہم میں تم میں بھی، خلش رہی بلا سبب
تھا جس کا ڈر وہی ہوا، جو کچھ ہُوا، ہُوا گیا

تمام عمر زندگی کی آرزو میں کٹ گئی
ملی وہ زندگی کہ زندگی کا ولولہ گیا

نویدؔ اب علاجِ دردِ دل کریں تو کیا کریں
دوائے دل جو بیچتا تھا وہ کہیں چلا گیا



اے حسن تیرے دید کی حسرت مٹی کہاں
اپنی نگاہ میں کوئی صورت بچی کہاں

تالے تھے مصلحت کے زباں پہ پڑے ہوئے
اے دوست آپ نے بھی ہمیں داد دی کہاں

خوشیوں کی جستجو میں جئے جا رہے ہیں ہم
چھوٹے گا تیرا ساتھ، غم زندگی کہاں

دیکھا جو ہم کو آنکھ بچا کر گزر گئے
ہم منتظر تھے آپ نے آواز دی کہاں

ہیں جدید رنگ میں اشعار دلنشیں
لفظوں کی راس آئے گی بازی گری کہاں

صادق نوید، کس کو سنائیں صدائے دل
اب وہ فضائے ذوقِ سخن پروری کہاں



تو نے مالک مری تقدیر جگا رکھی تھی
میرے حصے میں مری ماں کی دعا رکھی تھی

اب تو دل بن کے دھڑکتی ہے مرے سینے میں
تیری تصویر جو آنکھوں میں بسا رکھی تھی

ملنے آئے تو ملاقات نہ ہونے پائی
بیچ میں آپ نے دیوار اُٹھا رکھی تھی

شکوۂ تلخیٔ ایام گوارہ نہ ہُوا
میں نے بیتی ہوئی ہر بات بُھلا رکھی تھی

میکدہ دیر سے پہنچا تو ہوئی مجھ کو نصیب
میرے ساقی نے جو آنکھوں میں بچا رکھی تھی

زندگی تجھ کو اندھیرے سے بچانے کے لئے
میں نے احساس کی قندیل جلا رکھی تھی

پیکرِ عدل جہانگیر سا، آیا نہ کوئی
ہم نے انصاف کی زنجیر ہلا رکھی تھی

بند کمرے کی سیاست نے گلا گھونٹ دیا
سانس لینے کو کہاں تازہ ہوا رکھی تھی

اک الگ رنگ میں کہتے رہے اشعار نوید
آپ نے اپنی یہ پہچان، بنا رکھی تھی



نہ تیری ذات میں کچھ ہے نہ میری ذات میں ہے
تمام رفعت و عظمت، خدا کے ہاتھ میں ہے

گہن میں آس کا سورج ہے، چاند بدلی میں
نہ ہمسفر کوئی جگنو، اندھیری رات میں ہے

میں اپنی ذات میں سب کو سمیٹ لیتا ہوں
یہی تو وصف نمایاں، مری صفات میں ہے

مشام جاں ہے معطّر غزل کی خوشبو سے
غزل کا حسن، تراشیدہ لفظیات میں ہے

تباہیوں کا تسلسل ہے زلزلوں کی طرح
دل و دماغ گرفتار، حادثات میں ہے

یہ اور بات کہ رکھتا ہوں اپنے نام کی لاج
دگرنہ کونسی خوبی، مری حیات میں ہے

قدم زمیں پہ، نظر اپنی آسماں پہ نوید
وہی ہے قلب میں وسعت، جو کائنات میں ہے



لہو سے اپنے چمن، لالہ زار اپنا ہے
گلوں سا ہو جو محافظ، وہ خار اپنا ہے

میں اپنے آپ سے ملنے کبھی تو آؤں گا
بہت دِنوں سے مجھے انتظار اپنا ہے

ہمارا نام ہے وابستہ اُس کے نام کے ساتھ
ہے قریبِ رگِ جاں، وہ یار اپنا ہے

اُگا رہا ہے نئی فصل، سچ کے پودوں کی
یہ قافلہ جو رواں سوئے دار اپنا ہے

انا کے خول میں ہوتے تو ٹوٹ کے مر جاتے
حدوں کی آخری حد تک حصار اپنا ہے

صبا قریب کا ہم سے بھی واسطہ رکھنا
اک آشیانہ، سرِ رہگذار اپنا ہے

نوید اپنی بھی ہے اعتدال پسند
اسی اساس پہ قائم وقار اپنا ہے



لہجۂ دلنواز رکھتے ہیں
کچھ نہ کچھ امتیاز رکھتے ہیں

وہ جو اہلِ زبان ہیں، گویا
گفتگو کا جواز رکھتے ہیں

فطرتاً، ہم قلندروں کی طرح
اک دلِ بے نیاز رکھتے ہیں

کوئی پوچھے تو کچھ نہیں کہتے
راز کو ہم بھی، راز رکھتے ہیں

ہنس کے سہتے رہیں گے ظلم و ستم
ہم کہاں چارہ ساز رکھتے ہیں

اُن کے کہنے کی کیا ضرورت ہے
قد جو اپنا دراز رکھتے ہیں

کوئی کام آئے یا نہ آئے نوید
مالکِ کارساز رکھتے ہیں



دِلوں کو جیت لوں یارب کچھ ایسا فن بھی دے
زبان دی ہے تو لہجے کا بانکپن بھی دے

ہم اپنی ذات میں اک انجمن سہی لیکن
سخن نواز، ہمیں کوئی انجمن بھی دے

جدید نسل کو تخریب کاریوں سے بچا
خرد کے ساتھ انہیں کچھ دِوانہ پن بھی دے

بغیر صحن کے تعمیر ہو رہے ہیں مکان
ملے مکان تو تفریح کو چمن بھی دے

برائے نام کوئی کام کر کے کیا حاصل
عطا ہو کام تو پھر کام کی لگن بھی دے

عنایتیں تو تری بے شمار ہیں سب پر
زمانے بھر میں، محبت کا اِک چلن بھی دے

جب آئی آنچ وطن پر لہو دیا ہم نے
نوید اس کا صِلہ کچھ ہمیں وطن بھی دے

نظمیں

نذرِ مسیح
(تمام تر مطلعوں پر مشتمل)

ابنِ مریم ہو کہ قدرت کا کرشمہ، تم ہو
بے پدر آئے جو دنیا میں وہ یکتا، تم ہو
آن کی آن میں پھیلا جو اُجالا، تم ہو
نیکیوں سے جو عبارت ہے سراپا، تم ہو
دلِ بیمار کے لیے مثلِ مسیحا، تم ہو
حاملِ مصحفِ حق حضرتِ عیسیٰ، تم ہو
تھا حقیقت میں جو اللہ کا منشا، تم ہو
یعنی انجیلِ مقدس کا خلاصہ تم ہو
جس کو سمجھے نہ زمانہ وہ معمّہ تم ہو
رشکِ انساں ہو، نبی ہو کہ فرشتہ تم ہو
رُوح سے جس کا تعلّق ہے وہ رشتہ تم ہو
بندگی ناز کرے جس پہ وہ بندہ تم ہو
حق کی خاطر جو چڑھے دار پہ تنہا تم ہو
یہ نوید اپنا عقیدہ ہے کہ زندا تم ہو

سازِ حیات



ازل سے تا ابد رہے گا روز و شب کا سلسلہ
بڑا ہی تیز گام ہے یہ زندگی کا قافلہ
سحر کے ساتھ دوپہر ہے، شام ہے، یہ رات ہے
ہماری زندگی کی مختصر یہ کائنات ہے
نہ وقت کو ثبات ہے نہ عمر کو ثبات ہے
سفر میں سب ہیں ہمسفر، رواں دواں حیات ہے
بہت حسین و دلفریب ہے جہانِ رنگ و بو
دلوں کو گدگدائے گا سدا طلسمِ آرزو
جہاں قدم قدم پہ مشکلیں ہیں، راحتیں بھی ہیں
اگر ہیں نفرتیں تو اِن کے ساتھ چاہتیں بھی ہیں
ہیں خوبیاں اگر بہت تو کچھ حماقتیں بھی ہیں
کسی میں کوئی حسن ہے تو پھر نزاکتیں بھی ہیں
یہی تو خاص وصف ہے یہی تو خاص بات ہے
گلوں کے ساتھ گلستاں میں خار کا بھی ساتھ ہے

کرے نہ احترام آدمی کا، کیوں نہ آدمی
اُسی کے دم سے ہے جہانِ رنگ و بو میں دلکشی
ہوس کی تیز آندھیاں ہیں، آشیاں اُداس ہے
گلوں کا ذکر کیا کریں کہ گلستاں اُداس ہے
جو بھائی اپنے ہم وطن ہیں، صاحبانِ علم و فن
وہ جانتے ہیں دوستی ہے اپنے دیس کا چلن
شعورِ فکر کی کمی، کبھی نہ راس آئے گی
جلے گی شمع پیار کی تو روشنی دکھائے گی
صدائے امن دے کے سب کو ہمنوا بنائیے
قلم دلوں کو جوڑنے کے واسطے اٹھائیے

فخرِ ہندوستان

(نہرو صدی تقاریب کے موقعہ پر)



پاسبانِ امنِ عالم، رونقِ بزمِ جہاں
ایسا دانشور، مفکّر، بزمِ گیتی میں کہاں
اک جواہر لال تھا، اپنے وطن سا بے مثال
وادیٔ کشمیر جیسا، دلنشیں، اُس سا جمال
دیدنی تھا اُس کے ہونٹوں پر تبسّم سا شباب
اُس کا وہ کِھلتا ہوا چہرہ تھا یا تازہ گلاب
عزم تھا گاندھی کا جس میں، روح موتی کی رواں
وہ جواہر تھا، بڑا انمول ہیرا، بے گماں
رہنمائے جنگِ آزادی، وطن کی آبرو
جس کو رہتی تھی سدا امن و اماں کی جستجو

متحد جب ہو گئے آپس میں سب اہلِ وطن
سہل اُن پر ہو گئی تھی منزلِ دار و رسن
قافلے میں جنگِ آزادی کے شامل تھے سبھی
رنگ لایا خون شہیدوں کا تو آزادی ملی
متحد ہم پھر جو ہو جائیں، وطن کے واسطے
پھر ترقی کے نئے کھلنے لگیں گے راستے
ایکتا کے روپ میں آئے جو ایسا انقلاب
مطلعِ تاریخ پر اُبھریں گے بن کر آفتاب
اتحادِ اہلِ گلشن زندہ باد و زندہ باد
اے مثالی رشتۂ گنگ و جمن پائندہ باد

نذرِ جواہر لال



رہبرِ کارواں، جواہر لال
فخرِ ہندوستاں، جواہر لال
ناز کرتے تھے تجھ پہ گاندھی جی
اُن کا عزمِ جواں، جواہر لال
نام ہے جس کا جذبِ آزادی
اُس کی رُوحِ رواں، جواہر لال
بات کرتا تو پھول جھڑتے تھے
ایسا جادُو بیاں، جواہر لال
اِک مفکّر، عظیم دانشور
اَمن کا پاسباں، جواہر لال

قوم کے نونہال بچوں پر
دل سے تھا مہرباں، جواہر لال
باپ موتی تھا، گر سیاست کا
بیٹا ہوگا نہ کیوں، جواہر لال
پھول، خوشبو، گلاب کا عاشق
ہند کا باغباں، جواہر لال
یاد اُس کی دلوں میں زندہ ہے
گو، نہیں درمیاں، جواہر لال
خوبیاں اُس کی کیا بتائیں نوید
ہم کہاں اور کہاں، جواہر لال

روشنی کی کرن



یوں بھی صدیوں پرانا ہے یہ سلسلہ
نور و ظلمت کا ٹکراؤ ہوتا رہا
تیرگی روشنی سے اُلجھتی رہی
روشنی کی کرن کے تعاقب میں پھر
ظلمتیں دور تک پھیلتی ہی گئیں!
دیکھتے دیکھتے چارسُو
اک اندھیرا سا چھانے لگا

نفرتوں کا دُھواں پھیلتا ہی گیا
فتنے رجعت پسندی کے پھر جاگ اُٹھے
ہر طرف تیرگی
اقتدار و ہوس بن کے آگے بڑھی
ملک کی سالمیّت کو لاحق ہوا
ایک خطرہ نیا

دفعتاً روشنی کی کرن جاگ اُٹھی
پھیلتی ہی گئی
آنکھیں چُندھیا گئیں !

تیرگی موت ہے
نور ہے زندگی
جہد کرتے رہیں زندگی کے لئے
روشنی کے لئے !!

مولانا ابو الکلام آزادؔ

وہ جس کی چال ڈھال میں تزک و احتشام تھا
وہ ایک ایسا رہنما جو صاحبِ مقام تھا

خطیب بے نظیر تھا، ادیب بے مثال تھا
بلند ذوقِ شعر تھا، صحافی باکمال تھا

قلم میں اُس کے زور تھا، جمال تھا جلال تھا
مدیرِ البلاغ تھا، مدیرِ الہلال تھا

وطن کی آبرو تھا، اہلِ ہند کا امام تھا
نہیں کوئی کلام اس میں، وہ ابو الکلام تھا

عرب کی سرزمینِ پاک پر ترا جنم ہوا
ترا وطن دیارِ ہند ہی ترا صنم ہوا

ہُوا جو وقف تو وطن کی حرّیت کے واسطے
دکھائے ملک و قوم کو ترقیوں کے راستے

عظیم ملک میں عظیم لیڈروں کا ساتھ تھا
عمیق تیرا علم تھا تو اُن کا دستِ راست تھا

لگاؤ تجھ کو تھا وطن سے، ایکتا کا پاس تھا
ہُوا جو ملک منقسم تو، تو بہت اُداس تھا

کہا تھا اپنے بھائیوں سے تم وطن نہ چھوڑنا
وطن ہی اپنا گھر ہے، اپنے گھر سے منہ نہ موڑنا

نیا سال نئی اُمنگیں



نئی زندگی کا نیا ہے فسانہ
نئے حوصلے ہیں، نیا ہے زمانہ

مصیبت میں بھی آگیا مُسکرانا
مچلتا ہے لب پہ خوشی کا ترانہ

نیا سال ایسے دبے پاؤں آیا
کہ جیسے مُسافر کوئی گاؤں آیا

تمہیں کچھ پتہ ہے، نیا سال کیا ہے
یہ عمرِ گزیناں کا اک سلسلہ ہے

کبھی گیت ہے اور کبھی مرثیہ ہے
غزل کی طرح سج کے پھر آگیا ہے

مسرّت کا اظہار باہم کریں گے
نئے سال کا خیر مقدم کریں گے

نئے سال کو اب گلے سے لگاؤ
دِلوں میں محبت کا جادو جگاؤ

نئے سال پر تم نئے گیت گاؤ
مچل جائے دل ایسے نغمے سُناؤ

نیا سال ہر سال آتا رہے گا
خوشی کے خزانے لُٹاتا رہے گا

نوید اب نیا سال اس طرح آئے
جو نفرت کے بدلے محبت سکھائے

لہو اب نہ انساں کا انساں بہائے
کہیں جنگ دنیا میں ہونے نہ پائے

ہر انسان کو ہے بقا کی ضرورت
ہو جیسے ہوا اور غذا کی ضرورت

قومی گیت

آندھرا پردیش (حیدرآباد) سے سینٹ جارجس گرامر اسکول کے طالب علم ڈی۔ کرشنا کرن این۔ سی۔ سی۔ کیڈٹ نے ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو آل انڈیا قومی یکجہتی کیمپ گوالیار کی جانب سے منعقدہ قومی گیتوں کے مقابلہ میں یہ گیت ساز پر گا کر کل ہند سطح پر انعام اول حاصل کیا۔ جبکہ پنجاب اور مدھیہ پردیش کے گلوکار کیڈٹس بالترتیب دوسرے اور تیسرے نمبر پر رہے۔



کہتے ہیں سب سے اچھا یہ دیش پیارا پیارا
ہندوستاں ہمارا، ہندوستاں ہمارا

قومیں کئی یہاں ہیں، مذہب جُدا جُدا ہیں
عیسائی، ہندو مُسلم، سِکھ، بھائی کی طرح ہیں
صدیوں سے ہے یہ قائم، آپس کا بھائی چارا
ہندوستاں ہمارا، ہندوستاں ہمارا

مذہب کسی سے نفرت، ہرگز نہیں سکھاتا
انسان پھر یہ سب کچھ، کیونکر ہے بھُول جاتا
آپس میں ہم کریں گے مِل جُل کے سب گزارا
ہندوستاں ہمارا، ہندوستاں ہمارا

صادق نوید سب کی آنکھوں کا ہے یہ تارا
ہندوستاں ہمارا، ہندوستاں ہمارا

مژدۂ سالِ نو



سَو مرتبہ خوشی کا نیا سال دیکھنا
ہر سال زندگی کا نیا سال دیکھنا

قدرت کی اِک عطا ہے، مقدّر کی بات ہے
یہ بار ہا کِسی کا نیا سال دیکھنا

اہلِ وطن کو راس اب آئے خدُا کرے
آپس میں دوستی کا نیا سال دیکھنا

سب ظلمتوں کو چھوڑ کے ماضی کے دور میں
اچھا ہے روشنی کا نیا سال دیکھنا

ہر سال ہو نصیب تمہیں نیکیوں کا سال
ہرگز نہ تم بدی کا نیا سال دیکھنا

گلشن اُداس تو موسم خفا خفا
کیا ایسی بے کلی کا نیا سال دیکھنا

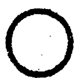
کیا کیا نہ جانے ہم کو مناظر دکھائے گا
اب عقل و آگہی کا نیا سال دیکھنا

آئے گا کب، نہ لوٹ کے جانے کیوں واسطے
یہ امن و آشتی کا نیا سال دیکھنا

نو آگیا ہے تحفۂ امن و اماں کے ساتھ
اب اپنی شاعری کا نیا سال دیکھنا

یہ اپنے دور کا ہے عجب المیہ نوید
بے چین آدمی کا نیا سال دیکھنا

جشنِ آزادی



آزادی کی لے پر گائیں
خوشیوں کا پرچم لہرائیں
ہم سب ہندوستانی مل کر
اپنی قومی عید منائیں

سب کی آنکھوں کا ہے تارا
دیش یہ اپنا، پیارا پیارا
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
ان سب کا ہے یہ گہوارہ

اپنے پرکھوں کی ہے امانت
آپس کا یہ بھائی چارا
مذہب کی بنیاد پہ ہم کو
پھوٹ نہیں ہرگز، یہ گوارا

نیتاؤں نے راہ دکھائی
آزادی جاں دے کر پائی
ہندو مسلم، سکھ عیسائی
سب نے وطن پر جان لٹائی

سب ہیں وطن کے چاہنے والے
سب کا وطن پر حق ہے بھائی
گلدستے کے پھول ہیں یہ سب
ہندو مسلم، سکھ، عیسائی

کام کچھ ایسا کرنا سیکھو
کانٹوں پر بھی چلنا سیکھو
سچے سیوک بن کے وطن کے
اپنے وطن پر مرنا سیکھو

ہند کی ہے تاریخ، پرانی
یکجہتی ہے اس کی نشانی
ہم سب ہند کے رہنے والے
باشندے ہیں، ہندوستانی

تصویر ے دو رُخ



ننھّا سا اک پیار کا پودا
جس کو ہم سب نے بویا تھا
رفتہ رفتہ پیڑ بنا وہ
پورب، پچھّم، اُتّر، دکّن
پھیل رہا تھا اُس کا سایا

—

اِس قد کو اونچا کرنے
امن کی ٹھنڈی چھاؤں کے دشمن
ڈالی، ڈالی، کو ٹکرا کر
نفرت کے آرے سے پیہم
اُس کی جڑوں کو کاٹ رہے ہیں

—

سہما سہما، پتّہ پتّہ
پیڑ شکستہ حال کھڑا ہے
باقی اب کہنے کو کیا ہے
کیسا ہے یہ کام نہ پوچھو
کیا ہوگا انجام نہ پوچھو

دو آنکھیں ـــ ایک منظر



برسوں سے یہ شہر ہمارا
امن و اماں کا ہے گہوارا
ہندو مسلم ہیں، دو آنکھیں
یکجہتی کا ایک نظارا

دل کی دھڑکن میں سانسوں میں
اِن دو متوالی آنکھوں میں
کس نے زہر بھرا نفرت کا
دُھول اُڑی، دن میں راتوں میں

اپنی کھٹکتی اِن آنکھوں کو
خون آلودہ، دو ہاتھوں کو
پیار کی شبنم سے دُھو ڈالیں
بھول کے سب بیتی باتوں کو

پھر اِن دو آنکھوں سے دیکھیں
مہر و وفا کا پیارا سا منظر

رُباعیاد



تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہم لوگ
تدبیر کا چڑھتا ہوا دریا ہم لوگ
طوفاں ہیں کبھی اور کبھی ہیں ساحل
رفتار میں بہتی ہوئی گنگا ہم لوگ



دانستہ شراروں سے اُلجھتے کیوں ہو
انگاروں کو تم راکھ سمجھتے کیوں ہو
لپکے گا جو شعلہ تو جُھلس جاؤ گے
ایندھن کی طرح آگ میں جلتے کیوں ہو



خاموشی کے پیکر میں ڈھلا جاتا ہوں
تنہائی کی تصویر ہوا جاتا ہوں
ایک طرفہ تماشہ ہے، روانی میری
کہتا ہوں تو کہتا ہی چلا جاتا ہوں



ٹوٹے ہوئے شیشے کی صدا ہوں شاید
اخلاص کا پیکر ہوں، وفا ہوں شاید
ناداں ہے جو دیوانہ سمجھتا ہے مجھے
میں جرمِ محبت کی سزا ہوں شاید



راحت کدۂ دہر میں راحت ہی نہیں
دنیا کی نگاہوں میں مروّت ہی نہیں
اُس شہر کو کیا شہرِ تمنّا کہیے
جس شہر میں انسان کی وقعت ہی نہیں



دل کی محفل کو ترے غم سے سجا رکھا ہے
ہم نے ہر سانس کو مصروفِ دُعا رکھا ہے
خوگرِ غم سے کوئی غم کا سلیقہ سیکھے
دل کو ہر [illegible] کا خریدار بنا رکھا ہے

قطعات



وقت کا انتخاب ہیں ہم لوگ
روز و شب کا نصاب ہیں ہم لوگ
دیکھتے کیا ہو پڑھ سکو تو پڑھو
زندگی کی کتاب ہیں ہم لوگ



ہاتھ رسماً سہی، ملانے آ
جانے والے اسی بہانے آ
مجھ میں جدّت بھی ہے روایت بھی
مجھ سے ملنے نئے زمانے آ



یہ دکن ہے ادب کا مخزن ہے
اس میں اُردو کا بانکپن ہے
اسکے شیدا تھے غالبؔ و اقبالؔ
داغؔ و فانیؔ کا یہ تو مسکن ہے



ساتھیوں کو سزا نہیں دیتے
دوستوں کو دغا نہیں دیتے
ہم بھی ہیں ایسے صاحبِ کردار
دشمنی کو ہوا نہیں دیتے



اب کہیں جنسِ وفا ہے نہ وفاداری ہے
سوزِ اُلفت نہ غمِ عشق کی جیدکاری ہے
پیار کے بول تو لب پر ہیں سلیقے سے مگر
یہ محبت کا ڈرامہ ہے، اداکاری ہے



روز و شب اِضطراب کیا کہیئے
وقت کا اِنقلاب کیا کہیئے
اب تو جیتے ہیں لوگ، مر مر کے
قسط واری عذاب کیا کہیئے



نکہتِ گل کی طرح گل کے اشاروں میں رہے
پیکرِ صدق و صفا پھول کے ہاروں میں رہے
یوں بھی ممکن نہیں کرنوں کا احاطہ کرنا
ہم تو خورشیدِ درخشاں کے نظاروں میں رہے



عہدِ ماضی تو کل کا سپنا ہے
کیا عبث نام اُس کا جینا ہے
یہ زمانہ کسی کے بس میں کہاں
کل تھا اوروں کا آج اپنا ہے



احساس کے چراغ جلاتے رہیں گے ہم
تاریکیوں میں راہ دکھاتے رہیں گے ہم
عنوانِ زندگی پہ ترے اعتماد سے
اشعار زندگی کے سناتے رہیں گے ہم



کسی کی بے وجہ ذلت نہ کرنا
تم اپنے بھائی سے نفرت نہ کرنا
کھڑی ہے آدمیّت کی عمارت
اسے ڈھانے کی اب زحمت نہ کرنا



جب کہوں دل کی واردات کہوں
یا پھر عینی مُشاہدات کہوں
عقل گھڑتی رہے گی تاویلیں!
غیر ممکن ہے دن کو رات کہوں



اپنے جسموں کا بوجھ ڈھوتے ہیں
کتنے خود دار، لوگ ہوتے ہیں
ہجر کی شب گزار کر جگنوں تو ں!
صبح کو چین سے وہ سوتے ہیں

○

پڑے جو کام کوئی، ہم سے کام لیتے ہیں
برائے نام، ہمارا بھی نام لیتے ہیں
حسد کی آگ میں جل جل کے روز و شب اکثر
وہ اپنے آپ سے بھی انتقام لیتے ہیں

○

امن کا قائم رہے یہ سلسلہ
کوئی رنجش کا نہ آئے مرحلہ
متحد ہو کر اسے ہم روک دیں
ملک دشمن ہے سیاسی زلزلہ

○

روز آتے ہیں سماجی زلزلے
ان کے پیچھے ہیں معاشی زلزلے
بے گناہوں کو بناتے ہیں شکار
وقفے وقفے سے سیاسی زلزلے

○



توبہ کی بات بادہ پرستوں سے کیا کریں
شکوہ اگر کریں بھی تو اپنوں سے کیا کریں
آدم بلند ہو گئے کر کے خطا، جناب
اپنی تو دوستی ہے فرشتوں سے کیا کریں



کتابِ دل کو سمجھ کر اِدھر اُدھر سے پڑھو
پڑھو تو دل سے پڑھو اور کبھی نظر سے پڑھو
کھُلی کتاب جو چوکھٹ پہ پھینک دے ناداں
وہی کتاب اُٹھا کر تم اُس کے گھر سے پڑھو



وقت کے فیصلے بدلتے ہیں
کھوٹے سکّے بھی خوب چلتے ہیں
وہ لگاتے ہیں جام ہونٹوں سے
اور ہم ہیں کہ ہاتھ ملتے ہیں



لوگ چہرے کئی بدلتے ہیں
چیونٹی کے بھی پر نکلتے ہیں
آستینوں سے باخبر رہنا
آستینوں میں سانپ پلتے ہیں



"زندگی" پر متفرق اشعار



عمر کا ساتھ رہا بھی تو تعارف نہ ہوا
زندگی تو بھی معمہ ہے، مقدر کی طرح

زندگی تیری رفاقت میں کٹی عمر، مگر
کوئی دولت نہ ملی، چشمِ بصیرت کے سوا

زندگی تجھ کو دل و جان سے چاہا ہم نے
پھر بھی برتاؤ ہے تیرا کسی دشمن کی طرح



جناب صادق نوید صاحب کو میں نے بارہا سُنا
ہے اور پڑھا بھی ہے۔ اُن کے اشعار نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے
ف ایک حسّاس دِل کے مالک ہیں، اِسی لیے جو کچھ بھی کہتے ہیں،
کر کے کہتے ہیں۔ اِن کے شعر فوراً دِل پر اثر کرتے ہیں اور
شاعری کی یہی پہچان ہے۔

صادق نوید صاحب کا مستقبل بے حد تابناک ہے وہ بہت
دب میں اپنے لیے نیا مقام بنالیں گے۔ میری نیک دُعائیں انکے
رہیں۔

خمارؔ بارہ بنکوی

حیدرآباد ۲ر ستمبر ۱۹۹۳ء

